ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

جنوری ۲۰۲۳ء

محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

۱۵/روپے

جناب وزیراعظم نریندر مودی 'ناری شکتی سنواد' (بنارس) پروگرام میں حصہ لیتے ہوئے ساتھ میں جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بھی موجود رہے۔

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جناب راج ناتھ سنگھ کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ		
اپنی بات		۲
مضامین		
اردو شاعری میں ہولی	ڈاکٹر سید محمود کاظمی	۳
صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسرت جہاں	۵
الطاف حسین عالم لکھنوی کی فارسی شاعری 'قند آبِ عجم' کے حوالے سے	ڈاکٹر علی اصغر	۹
ایک نفسیاتی افسانہ نگار: عصمت چغتائی	ڈاکٹر بدیع الزماں	۱۳
طوطی ہند امیر خسرو	ڈاکٹر سید ذوالقرنین	۱۵
ممتاز ترین ڈرامہ نگار۔ آغا حشر کاشمیری	عمر فاروق	۱۷
تقسیم ہند کا المیہ، خواتین اور فکشن	تبسم خاں	۱۹
منظومات		
غزل	مصداق اعظمی	۱۶
غزل	نسیم لکھنوی	۲۱
غزلیں	مخمور کاکوروی/ نیاز جیراجپوری	۲۲
غزلیں	فریدہ انجم/نفیس وارثی	۲۳
افسانے		
زندگی کی رفتار	رضوانہ پروین	۲۴
بے رخی چمن	احتشام الحق آفاقی	۲۶
جرم خانہ خراب	حمیرا عالیہ	۲۸
ترقیات		
وزراء کو وی آئی پی کلچر سے بچنا چاہیے	شاہد عباس	۳۲

ماہنامہ نیا دور، ویب سائٹ information.up.nic.in پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسی روپے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرجہ ای میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

جلد:77 شمارہ:09

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جنوری ۲۰۲۳ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ادارتی مشیر

محترمہ کُمکُم شرما (ڈپٹی ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

ریحان عباس

رابطہ:9838931772

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون: شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صبا عرفی:7705800953

آسیہ خاتون

تزئین کار: ایم۔ ایچ۔ ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰/ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

'ماہنامہ نیا دور' جنوری ۲۰۲۳ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

نیا دور کی ادارت کی ذمہ داری مجھے جنوری ۲۰۲۳ء میں سونپی گئی، لیکن نومبر ۲۰۲۰ء سے ۲۰۲۳ء کے درمیان نہ شائع ہونے والے شماروں کو بھی شائع کرنے کی ذمہ داری بھی مجھے ادا کرنی پڑی۔ مطلع کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ قارئین کی دعاؤں سے اور اسٹاف کی محنتوں سے وہ سارے شمارے شائع ہو گئے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپر کی شرط کے مطابق رسالے کا جاری رہنا ضروری ہوتا ہے ورنہ اس کا رجسٹریشن منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس لیے پہلے ان باقی ماندہ شماروں کو شایع کر دیا گیا۔

چونکہ مجھے جنوری ۲۰۲۳ء میں ایڈیٹر کی ذمہ داری دی گئی، اس لحاظ سے باقاعدہ یہ میرا پہلا شمارہ جو تیار ہو چکا تھا لیکن پارلیمانی الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہو جانے کے سبب آئیڈیل ضابطۂ اخلاق کی ہدایت کے مطابق نیا دور کے تیار شدہ شماروں کی اشاعت وقتی طور سے روک دی گئی تھی جس کے باعث کچھ تاخیر واقع ہو گئی ہے، ورنہ ۲۰۲۳ء کے باقی شدہ رسالے بھی اپنے متعین ہدف کو مکمل کر لیتے۔ دو برس قبل نیا دور کے ۷۵ برس مکمل ہو چکے ہیں۔ اسی لیے پلیٹنم جوبلی نمبر شائع کرنے کی تیاری بھی تقریباً پوری ہو چکی ہے۔ یہ خصوصی نمبر ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ پلیٹنم جوبلی نمبر بھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اس نمبر میں ملک کے مشہور ادیبوں اور قلم کاروں کے مضمون اور نیا دور کے پچھلے ۷۵ برسوں میں شائع شدہ نمایاں تخلیقات کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔

یہ بڑا اچھا موقع ہے کہ آپ نیا دور کی ممبر شپ قبول فرمائیں۔ سالانہ خریداری کی رقم صرف ۱۸۰ روپیہ ہے جو بہت ہی کم ہے۔ اگر آپ سالانہ خریداری کی رقم جلد ارسال فرماتے ہیں تو یہ خصوصی نمبر آپ کو ایک طرح سے ایک تحفہ سے کم نہ ہوگا۔ اردو زبان و ادب کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری رسالوں کے ممبر بنیں کیونکہ اس کی رقم بہت معمولی ہوتی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ گذشتہ ۷۷ برس سے مسلسل شائع ہونے والے رسالے کو آئندہ بھی زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس رسالے کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنیں اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس رسالے کی خریداری کے لیے تعاون فرمائیں۔

ریحان عباس

یہ شمارہ جنوری ۲۰۲۳ء کا ہے جس کو اپریل ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود کاظمی

صدر شعبۂ ترجمہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

9949060358

اردو شاعری میں ہولی

دنیا کے کسی بھی ملک یا خطہ کی تہذیب بنیادی طور پر چند ایسی خصوصیات رکھتی ہے جو دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں اس کی ایک الگ شناخت قائم کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب اس لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے کہ یہ مختلف تہذیبوں کا ایک بے حد حسین اور دل کش امتزاج ہے۔ یہ اس دھنک کی طرح ہے جس کے مختلف رنگ ایک دوسرے سے مل کر رنگ اور نور کا ایک ایسا طلسم خانہ وجود میں لے آتے ہیں جسے دیکھ کر کسی یک رنگ تہذیب کا پروردہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کیونکہ یہ معاشرتی وثقافتی تنوع اس کے وہم وگمان سے باہر کی چیز ہوتا ہے۔ مختلف زبانیں، لباس، کھانے، رقص وموسیقی، عقائد، رسم ورواج، مذہب اور جانے کیا کیا ایک دوسرے سے اس قدر الگ لیکن ان سب کے باوجود ایک ایسی زیریں وحدت ان میں پائی جاتی ہے جو ان مختلف رنگوں کو باہم ملا کر متحدہ اور عظیم ہندوستان کی شکل عطا کرتی ہے۔ جہاں تک زبان اور تہذیب کے باہمی رشتوں کا تعلق ہے تو زبان ہمیشہ تہذیب کا آئینہ ہوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ دنیا کی ہر زبان کسی نہ کسی تہذیب اور معاشرے کی مختلف النوع خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی زبان ایک بڑے اور متنوع تہذیبی منظرنامے کی بھرپور وموثر عکاسی اور عالمی لسانی وتہذیبی منظرنامے میں اس کی نمائندگی کرے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم دنیا کی مختلف زبانوں کی جانب دیکھتے ہیں تو اردو ہی ایک ایسی زبان قرار پاتی ہے جو ہندوستان کے ایک بڑے تہذیبی منظرنامے اور تکثیری معاشرے کی انتہائی فطری، دلکش اور موثر عکاسی کرتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ اگر کہیں نظر آتی ہے تو وہ ہندوستان کی اسی زبان میں جسے اس کی بعض لسانی وادبی خصوصیات کی بناء پر اکثر وبیشتر یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ اردو اپنے تہذیبی وثقافتی مزاج کے نقطۂ نظر سے ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب سے زیادہ ایرانی تہذیب وثقافت سے زیادہ قریب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ الزام بڑی حد تک غلط اور بے بنیاد ہے۔ اردو زبان وادب یہاں تک کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ، اس کا لسانی ڈھانچہ سب کا سب ہندوستانی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کا وجود اور اس کا عہد بہ عہد ارتقاء اس ملک میں آباد ان دو اہم اور بڑی قوموں کے باہمی اشتراک واتصال کا نتیجہ ہے جو کہ تہذیبی، لسانی، ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ ایسی دو بڑی قوموں کا یہ باہمی اشتراک سرزمین ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے خطۂ زمین پر ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ یہ ملک ابتدائے آفرینش سے ہی مختلف مذہبوں اور قوموں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس سرزمین پر مختلف ادوار میں آ کر بسنے والی قوموں کی تہذیب، مذہب، زبان اور رسم ورواج نیز طرز زندگی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا تھا لیکن جب یہ قومیں ہندستان آ کر یہاں ہمیشہ کے لیے آباد ہوگئیں تو پھر ان کے آپسی میل ملاپ سے ایک نئی اور انتہائی طاقت ور تہذیب کا جنم ہوا جسے آج ہم ہند ایرانی تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ اسی ہند ایرانی تہذیب کی تمام تر خصوصیات کو اگر ہندوستان کی کوئی زبان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے تو وہ اردو زبان ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ”گیارہویں صدی میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا باقاعدہ سابقہ شروع ہوا تو باہمی اشتراک اور اختلاط سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آنے لگا۔ مغلوں کے عہد حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں میں مذہب کے ظاہری اختلاف کے باوجود عوام کی سطح پر باطنی یک رنگی اور اندرونی وحدت پیدا ہو چکی تھی اور ایک ملی جلی معاشرت وجود میں آ رہی تھی۔ ہماری اردو شاعری اسی مخلوط معاشرت کی ترجمان ہے۔“[1]

مندرجہ بالا اقتباس کو سامنے رکھ کر یہ بات بہ آسانی تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اردو شاعری اپنے مزاج کے لحاظ سے اجتماعی طرز زندگی کے شعور کو زیادہ سے زیادہ قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو زبان کا سرمایۂ شعر وادب بنیادی طور پر اعلیٰ انسانی اقدار، وسعت قلب اور وسیع المشربی کا حامل رہا ہے۔ اگر ایک طرف پیغمبر اسلام کی عظیم ترین شخصیت کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے تو دوسری جانب

> ”تہواروں اور عقائد وتقریبات سے متعلق اردو کے شعری سرمائے پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے دلکش، پراثر اور خوب صورت نظمیں اگر کسی تہوار پر لکھی گئی ہیں تو وہ ”ہولی“ ہے۔ اردو میں عید پر شائد ہی اس پائے کی کوئی نظم ہو جس طرح کی عمدہ اور شعریت سے بھرپور نظمیں ہولی پر کہی گئی ہیں۔ ولی دکنی سے لے کر قائم، جرأت، مصحفی، فائز، سحر لکھنوی، شاہ حاتم اور نظیر اکبرآبادی نے ہولی پر نظمیں لکھی ہیں۔ خاص طور پر نظیر نے تو بلاشبہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ نظیر کی ہولی سے متعلق نظموں پر اظہار خیال کرنے سے قبل اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں ہولی پر کہی گئی نظموں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہولی سے متعلق نظمیں اردو کے تقریباً ہر شاعر نے کہی ہیں اور اپنے اپنے شعری مزاج کے زیر اثر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ یہاں تک کہ اردو میں شاعری کرنے والے بادشاہوں، نوابوں اور امراء نے بھی ہولی پر نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں مغل بادشاہ شاہ عالم آفتاب اور نواب واجد علی شاہ اہم ہیں۔ شاہ عالم سے متعدد ہولیاں منسوب ہیں۔“

کرشن کنہیا کے باپلن پر بھی اسی عقیدت و محبت سے اردو شعراء نے نظمیں کہی ہیں۔ پروفیسر محمود الحسن اپنے مضمون ''جدید اردو شاعری میں سیکولر روایات'' میں لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب اور اس کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور اجتماعی طرز زندگی کے شعور کو زیادہ سے زیادہ تقویت بخشی جائے اور اس کی تبلیغ بھی کی جائے۔ اسی لیے شاعری کے ہر دور میں وسیع المشربی، مذہبی رواداری اور یک جہتی کی مثالیں آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں۔'' [۲]

اردو شاعری کے ایسی سیکولر کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم اردو کے شعری سرمائے کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وسیع المشربی اور رواداری کی جس قدر خوب صورت مثالیں اردو شاعری میں ہم کو نظر آتی ہیں، ان سے دوسری ہندوستانی زبانوں کا دامن کسی حد تک خالی ہے۔ بقول ڈاکٹر اختر بستوی:

''اردو کے شعری ادب میں ایک مذہب کے ماننے والے شعراء نے دوسرے مذاہب کے بزرگوں تہواروں اور عقائد و تقریبات پر نظمیں لکھنے کی ایسی شاندار اور سیکولر روایت قائم کی ہے جس کی نظیر عالمی ادب میں بھی نہیں مل سکتی۔'' [۳]

تہواروں اور عقائد و تقریبات سے متعلق اردو کے شعری سرمائے پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے دلکش، پر اثر اور خوب صورت نظمیں اگر کسی تہوار پر لکھی گئی ہیں تو وہ ''ہولی'' ہے۔ اردو میں عید پر شائد ہی اس پائے کی کوئی نظم ہو جس طرح کی عمدہ اور شعریت سے بھرپور نظمیں ہولی پر کہی گئی ہیں۔ ولی دکنی سے لے کر قائم، جرأت، مصحفی، فائز، سحر لکھنوی، شاہ حاتم اور نظیر اکبر آبادی نے ہولی پر نظمیں لکھی ہیں۔ خاص طور پر نظیر نے تو بلاشبہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ نظیر کی ہولی سے متعلق نظموں پر اظہار خیال کرنے سے قبل اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں ہولی پر کہی گئی نظموں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر فائز دہلوی ہولی کا بیان اس طرح کرتا ہے۔

سب کے تن پر ہے لباس کیسری — کرتے ہیں صد برگ سوں سب ہم سری
چاند جیسا ہے شفق بھیتر عیاں — چہرہ سب کا از گلال آتش فشاں

ہولی کا تہوار اپنی مخصوص رنگا رنگی کے لیے مشہور ہے۔ اس طوفان رنگ و بو میں سبھی اپنے اختلافات کو فراموش کر کے گلے مل جاتے ہیں۔ جسے دیکھئے وہ مختلف رنگوں میں نہایا ہوا ہے۔ اس منظر کی بے حد سچی اور حقیقی تصویر شاہ حاتم نے اس طرح کھینچی ہے۔

گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی — پکارے یک سک ہولی ہے ہولی
لگی پچکاریوں کی مار ہونے — ہر اک رنگ کی بوچھار ہونے
کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری — کوئی چمپا بدن عمروں میں تھوڑی
کھلے بالوں میں ہے ابرک کی افشاں — کہ جیسے رات کو تارے ہوں رخشاں
تماشا سا تماشا ہو رہا ہے — کہ ہر اک ہاتھ سے جی دھو رہا ہے

میر تقی میر کی شاعری دل اور دلی کا مرثیہ کہی جاتی ہے اور ایک مخصوص حزنیہ کیفیت کی حامل ہے لیکن اس کے باوجود ہولی سے متعلق اپنی مثنوی میں وہ اس نشاطیہ کیفیت کی بے حد حقیقی اور فطری ترجمانی کرتے ہیں جو ہولی کے تہوار کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ اسی مثنوی سے یہ تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

قمقمے جو گلال کے مارے — مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں — گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نو روز ہند ہولی ہے — راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

ہولی سے متعلق نظمیں اردو کے تقریباً ہر شاعر نے کہی ہیں اور اپنے اپنے شعری مزاج کے زیر اثر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ یہاں تک کہ اردو میں شاعری کرنے والے بادشاہوں، نوابوں اور امراء نے بھی ہولی پر نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں مغل بادشاہ شاہ عالم آفتاب اور نواب واجد علی شاہ اہم ہیں۔ شاہ عالم سے متعدد ہولیاں منسوب ہیں۔ واجد علی شاہ نے بھی ہولی پر اشعار کہے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کو بنیادی طور پر ایک عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عوامی موضوعات پر جس قدر حسین نظمیں نظیر نے لکھی ہیں وہ کسی دوسرے سے ممکن نہیں ہو سکا۔ ہولی پر نظیر نے ایک یا دو نہیں بلکہ دس نظمیں لکھی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اس حسین و رنگین تہوار کا جائزہ لیا ہے۔ نظیر نے یہ نظمیں اس قدر ڈوب کر کہی ہیں کہ جس کا جواب نہیں۔ ان کی وسیع المشربی، رواداری اور وسعت قلبی کی ترجمان یوں تو ان کی پوری شاعری ہے لیکن جب وہ تہواروں بالخصوص ہولی پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا انداز بے حد فطری ہوتا ہے۔ نظیر کی انہی نظموں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ادھر سے رنگ لینے آؤ ادھر سے ہم
گلال عبیر ملیں منہ پہ ہو کے خوش ہر دم
خوشی سے بولیں ہنسیں ہولی کھیل کر باہم
بہت دنوں سے ہمیں تو تمہارے سر کی قسم
اسی امید میں تھا انتظار ہولی کا

بھاگے ہیں کہیں رنگ کسی پر جو کوئی ڈال — وہ پوٹلی مارے ہے اسے دوڑ کے فی الحال
یہ ٹانگ گھسیٹے ہے تو وہ کھینچے ہے پکڑ بال — وہ ہاتھ مروڑے تو یہ توڑے ہے کھڑا گال
اس ڈھب کے ہر اک جا پہ مچے ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

میاں تو ہم سے نہ رکھ کچھ غبار ہولی میں — کہ روٹھے ملتے ہیں آپس میں یار ہولی میں
مچی ہے رنگ کی کیسی بہار ہولی میں — ہوا ہے زور چمن آشکار ہولی میں
عجب یہ ہند کی دیکھی بہار ہولی نے

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
ساغر مئے کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں جھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس مختصر سے جائزے سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری اپنے سیکولر مزاج و کردار کے باعث ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی صحیح معنوں میں حقیقی ترجمان ہے۔ اور یہی اردو شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

حوالہ جات

1۔ کلاسیکل اردو شاعری اور ملی جلی معاشرت از پروفیسر گوپی چند نارنگ، بحوالہ قومی یکجہتی نمبر: نیا دور لکھنؤ، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۹۳، صفحہ ۳۱

2۔ جدید اردو شاعری میں سیکولر روایات از پروفیسر محمود الحسن، بحوالہ قومی یکجہتی نمبر: نیا دور لکھنؤ، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۹۳، صفحہ ۶۳

3۔ سیکولرازم اور اردو کا شعری ادب از ڈاکٹر اختر بستوی، بحوالہ قومی یکجہتی نمبر: نیا دور لکھنؤ، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۹۳، صفحہ ۱۴

❑❑❑

ڈاکٹر مسرت جہاں

اسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، ویشالی مہیلا کالج، ویشالی

8969042640

صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

بیگم صالحہ عابد حسین کا شمار ۲۰ ویں صدی کی ذہین اور روشن دماغ عورتوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں صنف افسانہ نویسی، ناول نگاری، ڈراما نگاری، سفر نامے اور تنقید و تحقیق کے نادر نگارشات یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے ادب پر بھی کام کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر موضوعات آزاد ہندوستان کے مسلم معاشرے خصوصاً متوسط طبقے کی خانگی زندگی کے مسائل ہوتے ہیں۔ خانگی زندگی کے مسائل ان کی کہانیوں کی بازگشت ہیں۔ اس کے پس پشت محترمہ کے گھریلو روایات کی پاسداری، اور ان کا علمی و فنی مذاق کارفرما ہیں۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت ''یادگار حالی'' سے ملی۔ یہ کتاب خواجہ الطاف حسین حالی کی حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ خود انھیں کے خاندان کی ایک رکن عزیزی بیگم صالحہ عابد حسین کو اس کام کی ضرورت کا احساس ہوا، اور انھوں نے وہ تمام حالات جو خاندانی وسائل سے حاصل ہو سکتے تھے خوش اسلوبی کے ساتھ رسالے میں جمع کر دیئے۔ بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں ہے مگر مطلوبہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد ہے جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا تھا اور جو اگر قید کتابت میں نہ آجاتا تو ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتا۔'' (۱)

بیگم صالحہ کی پیدائش ۱۸/ اگست ۱۹۱۳ء کو پانی پت میں ہوئی۔ ان کا اصل نام مصداق فاطمہ اور والد کا نام خواجہ غلام الثقلین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب خواجہ عبداللہ انصاری سے ہوتا ہوا صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ وہ خواجہ الطاف حسین حالی کی نواسی تھیں۔ ان کے والد وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور علم و فضل، ایمان داری اور دیانت داری میں مشہور تھے۔ ان کے دو بھائی، خواجہ غلام السیدین ماہر تعلیم تھے اور دوسرے خواجہ احمد عباس جو مشہور ادیب، افسانہ نگار اور فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر تھے۔ بیگم صالحہ کی شادی ۱۹۳۳ء کو سید عابد حسین کے ساتھ ہوئی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ تھے اور پائے کے دانشور، صاحب طرز ادیب اور رہنما تھے۔ لہذا بیگم صالحہ عابد حسین کو ہر جگہ علمی و ادبی ماحول ملا اور انہوں نے اپنے ادبی مذاق کو بام عروج تک پہنچایا۔

بیگم صالحہ نے چھوٹی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور آخر عمر تک لکھتی رہیں۔ ان کا خاندان بہت بڑا تھا۔ وہ لوگ مخلص، ہمدرد، علم پرورد اور دوست پرور تھے۔ دوستوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ ان کے ملنے جلنے والوں میں مختلف شعبہ حیات کے لوگ ہوتے تھے۔ شاعر و ادیب، اپنے، پرائے، پڑوسی، ملازم حتی کہ بچے بھی ہوتے تھے۔ ان کے خاندان اور کنبے میں عورتوں کا بھی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان سب کے درمیان بیگم صالحہ بیٹھتی تھیں اور آتش رفتہ کی کہانیاں مزے لے لے کر سنا کرتی تھیں۔ اصل میں انھیں کہانی لکھنے کی ترغیب یہیں سے ملی۔ اور وہ لکھنے کی طرف مائل ہو گئیں۔ ان کے متعلق قرۃ العین حیدر کتاب نما کے خصوصی شمارے میں لکھتی ہیں:

> ''صالحہ عابد حسین، انیس قدوائی اور نذر حیدر تینوں شدید حس مزاح خواتین تھیں انھوں نے کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھی، ڈاکٹریٹ حاصل نہیں کی، صرف اپنی ذہنی صلاحیت، ذوق و شوق اور اپنے گھرانوں کی روایات کی بناء پر باخبر اور وسیع المطالعہ خواتین تھیں۔'' (۲)

بیگم صالحہ اپنے طرز کی منفرد ادیبہ تھیں۔ حقیقت نگاری اور پریم چند کے افسانوی مسلک کی پیروی کرنے والی فنکارہ میں بیگم صالحہ عابد حسین کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے بلاشبہ اپنی تخلیقات سے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ مصنفہ نے تقریباً چار درجن افسانے لکھے ہیں۔ ان کے سبھی افسانے زمینی حقیقت کے پرتو ہیں۔ انہوں نے معاشرے کی صورت حال پر تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے۔

> ''صالحہ عابد حسین کو اردو وراثت میں ملی تھی۔ اپنی وراثت کی حفاظت اور علمی شوق کو پروان دینے کے لیے انھوں نے نت نئے موضوعات اور جدت و ندرت کی رنگارنگی کو خاطر میں لایا۔ اسی تخیل کی رنگ آمیزی کے ساتھ انھوں نے آٹھ ناول جیسے 'عذرا، آتش خاموش، راہِ عمل، قطرے سے گہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، الجھی ڈور، گوری سوئے سیج پر اور ساتواں آنگن ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'نراس میں آس، درد و درماں، ساز ہستی، تین چہرے تین آوازیں اور ٹوٹنگے ہیں۔ 'نقش اول' کے نام سے ان کے ڈراموں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ انہوں نے اپنا سفرنامہ 'سفر زندگی کے لیے سوز و ساز' بھی لکھا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں حالی، بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے، امتحان اور بنیادی حق وغیرہ شامل ہیں اور ترجمہ کی گئی کتابوں میں وحدت (از گاندھی جی)، باپو (بچوں کے لیے)، بڑا پاپی: مجمدار وغیرہ شامل ہیں۔''

متنوع موضوعات کی مناسبت سے قصہ، پلاٹ، کردار اور مکالمے کی واضح شمولیت اور اظہار کے نئے نئے طریقے سے وہ کہانی کہتی ہیں۔ البتہ کہانی کو فطری روپ دینے کے لئے انہوں نے متفرق نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص نظریات کی حامل نہ بن سکیں۔

صالحہ عابد حسین کو اردو وراثت میں ملی تھی۔ اپنی وراثت کی حفاظت اور علمی شوق کو پروان دینے کے لیے انھوں نے نت نئے موضوعات اور جدت وندرت کی رنگارنگی کو خاطر میں لایا۔ اسی تخیل کی رنگ آمیزی کے ساتھ اُن کے آٹھ ناول جیسے 'عذرا، آتش خاموش، راہِ عمل، قطرے سے گہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، الجھی ڈور، گوری سوئے سیج پر اور ساتواں آنگن ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'نراس میں آس، درد و درماں، سازِ ہستی، تین چہرے تین آوازیں اور ٹُو نگے' ہیں۔ 'نقش اول' کے نام سے ان کے ڈراموں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ انہوں نے اپنا سفر نامہ 'سفر زندگی کے لیے سوز وساز' بھی لکھا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں حالی، بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے، امتحان اور بنیادی حق وغیرہ شامل ہیں۔ اور ترجمہ کی گئی کتابوں میں وحدت (از گاندھی جی)، باپو (بچوں کے لیے)، بڑا پاپی: مجمدار وغیرہ شامل ہیں۔ بہر کیف! ان باتوں سے قطع نظر فی الوقت میں ان کے افسانوی انتقاد پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتی ہوں۔

افسانوی مجموعہ 'ٹُو نگے' ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ ٹو نگے کے افسانوں میں 'شمتا تت، ہمسایہ، ملاپ، ماں، بلا، سہاگ رات، بابا، خوشی کی چند گھڑیاں، ایک عالم ہے اس رنگ میں اور ہمدرد' ہیں۔ افسانہ 'بلا' میں ہندوستانی قلیوں کی کربناک زندگی کا تبصرہ ہے۔ صالحہ عابد حسین نے ہندوستان کے انتہائی نچلے طبقے کے محنت کش لوگوں کی زندگی کی کہانی بلا کی زبانی سنوائی ہے۔ جا بجا بلا شہری زندگی اور انگریزی تہذیب سے مرعوب ہندوستانی عورتوں پر بھی طنز کرتا ہے۔ آخر میں مصنفہ اپنی عجیب و غریب کیفیت اور تخیل میں آنے والے مختلف خیالات سے نبرد آزما ہیں اور اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر کچھ اس طرح اتارتی ہیں:

"تم خیالی دنیائیں بساؤ۔ رنگین کہانیاں لکھو، رومانی افسانے سناؤ۔ تم کیا جانو تمہارے دیس کے لاکھوں باسی اب تک کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ مفلسی، جہالت۔ گندگی، بھوک، محنت اور ذلت کے بھنور میں پڑے ہیں۔ سسک رہے ہیں؟ نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔ سود در سود کا چکر۔ رشوت کی گرم بازاری، خود ساختہ رہنماؤں کی بے دیانتی، قوم کے خیر خواہوں کی بے عملی یا سہل انگاری کی چکی، انھیں پیس رہی ہے۔ جن کا ماضی تاریک تھا جن کا حال تاریک ہے۔ اور جن کا مستقبل کون جانے؟" (۳)

افسانہ 'ہمدرد' میں نسوانی فطرت اور کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ کی ہیروئن ملکہ (کلرک کی بیوی ہے) ہمیشہ سے ہی شاکی ہے۔ اس کے مزاج میں باغی پن ہے۔ ملکہ کے سامنے اس کے گھر، بچے اور اخراجات کے مسئلے ہیں۔ اس کی طبیعت ان مسئلوں سے گھبرا کر اکثر شکایت کرتی رہتی ہے۔ مگر رانی (چپراسی کی بیوی ہے) صابر وشاکر ہے۔ وہ ایک خود دار اور غیرت مند عورت ہے۔ اسے اپنی محنت اور قسمت پر بھروسہ ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے تحت ملکہ کے گھر کا کام کرتی ہے۔ ان دونوں کی طبیعت اور مزاج میں مماثلت تھی۔ اس لئے بہت جلد دوستی ہو گئی اور کوئی تکلف نہ رہا۔ باوجود اس کے ان دونوں کو آقا اور نوکر ہونے کا احساس تھا۔ آقا اور نوکر کا احساس اس وقت مٹ جاتا ہے جب ان کے بچے ایک ہفتے کے آگے پیچھے اللہ کے پیارے ہو گئے۔ آخر میں مصنفہ نے دو دکھے ہوئے دلوں کی آواز کو بلا تفریق جس بے تکلفی سے پیش کیا ہے، خلوص و ہمدردی کی اس سے عمدہ مثال نہیں مل سکتی ہے۔

دو دکھیا مائیں...... ایک دوسرے کا دکھ پوری طرح محسوس کرنے والی بہنیں، سچی شریک غم۔ ایک دوسرے سے لپٹی آنسو بہا رہی تھیں۔ اب تنہائی نہ تھی! سناٹا نہ تھا۔ کرب ناک اذیت نہ تھی۔ ویرانی نہ تھی۔ دکھ تھا...... غم فراق بھی تھا...... مامتا کی ہوک بھی سینوں میں سوراخ کر رہی تھی...... مگر سچا 'ہمدرد' پا کر وہ اس عظیم غم کو سہارنے کا حوصلہ پا گئی تھی۔ اور آج وہ سچ مچ ایک دوسرے کی بہنیں تھیں...... گہری پر خلوص محبت کا ایک ہی چشمہ دو دلوں میں ابل رہا تھا۔ (۴)

اس کہانی میں صالحہ عابد حسین کی شخصیت ایک پیغامبر کا روپ دھارے ہوئی ہے۔ وہ ان سبھی مسئلوں کا حل چاہتی ہیں جو متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر پرسکون اور آسودگی کا اظہار کرتی ہیں لیکن ان کے دل میں ایک طوفان بپا ہوتا ہے۔ ایک پل کے لئے مضطرب اور بے چین ہو جاتی ہیں مگر کارخانہء حیات کا نظام ہی کچھ اس طرح کا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے خود کو سنبھال لیتی ہیں اور لکھتی ہیں:

"حالت تو یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی تو اس جیسے ہیں دیس میں کہ ایک کمانے والا اور آٹھ دس کھانے، پہننے، تعلیم پانے والے جن کا اپنا ہی پورا نہیں ہوتا تو دوسروں کے کیا کام آئیں گے؟ جب تک دیس کی معاشی حالت نہ سدھرے گی۔ جب تک سب بیکاروں کو کام نہ ملے گا۔ جب تک بچوں کو تعلیم بیماروں کو دوا علاج، محتاجوں، ضرورت مندوں کو ان کی حاجتیں مفت نہ ملیں گی۔ اس دیس سے غربت، جہالت، بیماری، مصیبت کیسے دور ہو سکتی ہے بھلا؟" (۵)

افسانہ 'اک عالم ہے اسی رنگ میں' افسانوی مجموعہ 'ٹُو نگے' کا اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ نوخیز عمر کی لڑکیوں کے لئے معلومات عامہ ہے۔ نزہت ماں کی مرضی کے خلاف شاپنگ کے لئے جاتی ہے۔ شاپنگ میں دیر ہونے کی وجہ سے بہ مشکل دیر رات کو گاڑی پر سوار ہوتی ہے۔ گاڑی والے کی بدنیتی کو بھانپتے ہوئے دوڑتی کار سے چھلانگ لگا دیتی ہے۔ اس نے چھلانگ لگا کر ہمت اور صداقت کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے پیر سے معذور ہو گئی، مگر اس کے چہرے پر جیت کی پرسکون مسکراہٹ تھی، اس کا دل غموں سے بے نیاز تھا، مسرتوں سے خود کو ہمکنار سمجھ رہی تھی۔ وہ اپنی روتی ہوئی ماں کو کچھ اس طرح تسلی دلاتی ہے:

"امی جی روئیے نہیں...... خدا کا شکر کیجئے...... ہڈیاں ٹوٹ گئیں بلا سے۔ خدا نے مجھے شیطان کے پنجے سے بچا لیا۔" (۶)

افسانہ 'ماں' ماں کی بے لوث محبت اور اس کے جذباتی رشتے کی عکاس ہے۔ معذور بچہ ہو یا صحت مند ماں کی نظروں میں ان کی محبت ایک سی ہوتی ہے۔ ایک پل کے لئے معذور بچوں سے ماں کی ہمدردی بڑھ جاتی ہے۔ معذور اور لاچار بچوں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے پاس پڑوس، اپنے پرائے و عزیز واقارب، بچے کی موت کی دعا کرتے ہیں اور نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر اس لمحہ ماں کی ممتا لرز جاتی ہے۔ بیگم صالحہ ازدواجی زندگی کو بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان کے یہاں شوہر بیوی کے رشتے ٹھوس اور پائدار ہوتے ہیں۔ قوت ارادی کے دھنی ہوتے ہیں۔ آپسی رنجش سے غمزدہ ہوتے ہیں مگر لاتعلق نہیں ہوتے ہیں۔ اسی بات کی غمازی افسانہ "ملاپ" میں ہوا ہے۔ جبکہ افسانہ 'شمتا تت ہمسایہ' میں چاک و چوبند نہ رہنے کے سبب ایک ہی گھر میں بار بار چوری ہوتی ہے۔

افسانوی مجموعہ 'تین چہرے تین آوازیں' ۱۹۸۶ء مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس کے افسانوں کی کل تعداد بارہ ہیں 'پیاسی ندی، جذبہ معصوم، زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا، ہمہ داغ داغ، بیکار سامان، چارہ گر، مگر وہ ٹوٹ گئی، اچھوتی، دل دل، وقت وقت، تین چہرے تین آوازیں اور راند مال' ہیں۔

افسانہ 'زندگی نام ہے مرمر کے جیے جانے کا' میں مصنفہ زندگی کی اصل معنویت کو سمجھانے میں کامیاب ہیں۔ موصوفہ نے اشرافیہ طبقے کی بے خبری اور بے حسی کا پردہ چاک کیا ہے، جو اپنی ذات میں محو اور اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں اور تنہائی پسند کرتے ہیں۔ معاش و روزگار کے اعتبار سے ایک متوسط خاندان کی نسوانی کردار راضیہ ہے۔ دوسرا فارغ البال وخوشحال خاندان کا چہرہ عائشہ ہے۔ عام طور سے ہمارے معاشرے میں متوسط خاندان کی اکثریت پائی جاتی ہے۔ ان کی پوری زندگی غریبی، مفلسی، محرومی، نامرادی، جدوجہد اور مشکل و مشقت میں گزرتی ہے۔ راضیہ بھی جدوجہد و مشقت کی نادر پیکر ہے۔ اس کے یہاں مال و دولت کی فراوانی نہیں ہیں۔ اس کا شب و روز کسب معاش کی فکر میں گزرتا ہے اس کے باوجود راضیہ کا دل بہت بڑا ہے۔ وہ لوگوں کی مدد اور محبت کا خلوص جذبہ رکھتی ہے۔ اس کی زندگی سراپا محبت اور مدد کا مجسمہ ہے۔ محبت کا یہ تصور

تشفی، تسلی، عقیدت، اپنائیت اور خلوص کا بھرپور احساس پیدا کراتا ہے۔ ان سبھی احساسات کے ساتھ عائشہ راضیہ کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس کی مصروفیت کو خوش بختی میں شمار کرتی ہے اور جدوجہد کو مسرت جانتی ہے۔ یہ احساس اسے اس وقت ہوا جب راضیہ اپنی تمام تر کمیوں اور مشکلات کے ساتھ ایک بوڑھی عورت کی مدد پیسوں سے کرتی ہے۔ تبھی عائشہ کا ذہن جھنجھنا اٹھتا ہے:

”راضیہ تم نے سچ کہا تھا۔ زندگی صرف اپنے ہی گرد نہیں گھومتی۔ اس کا دائرہ وسیع۔۔۔۔ وسیع تر کرنا چاہئے۔ شاید تبھی دلوں کو چین مل سکتا ہے۔ بے چین دلوں کو۔ شاید خوشی کا یہی رنگ ہے۔ جس سے ہم اور ہمارا بڑا طبقہ محروم ہے۔“(۷)

عائشہ دوسروں (اپنے سے کم رتبہ) کے دکھ درد کو جاننے کے بعد اپنے آپ سے ہم نوا ہوتی ہے:

”ہم کتنا غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ دوسروں کے لئے۔۔۔۔ ہم...... ہمارا طبقہ ...... کتنا بے خبر، کتنا بے حس رہتا ہے۔ اپنے میں گم، اپنی ذات میں محو۔“(۸)

افسانہ ’چارہ گر‘ کی نازلی ڈپریشن کی شکار ہے۔ نازلی کے گھر میں عیش و عشرت، آرائش و زیبائش کے سبھی سامان مہیا ہیں۔ نئی وضع کا گھر اور فلش باتھ روم، برآمدوں اور صحن کا فلیٹ ہے۔ زیور اور قیمتی کپڑوں سے الماریاں بھری پڑی ہیں۔ حتیٰ کہ گاڑی، گھوڑا، نوکر چاکر سب کچھ موجود ہے۔ مگر اس کی دلچسپی ان چیزوں میں نہیں ہے۔ نازلی خوش و خرم زندگی سے کوسوں دور اپنی زندگی سے بیزار ہے۔ وہ مصروفیت اور سوچ و فکر سے بے نیاز، خالی وقت، خالی دماغ اس کے لئے ناسور بن جاتا ہے۔ بے عملی کی شکار نازلی بیمار رہنے لگتی ہے۔

نازلی کی بیزارگی اور بیماری کو اس کی دوست مریم نے پہچان لیا اور اس کا حل بھی ڈھونڈ لیتی ہے۔ مریم نازلی کے شوہر کے ساتھ مل کر اس کی صحت کے متعلق ایک منصوبہ تیار کرتی ہے اور مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اسے طرح طرح کی مشغولیت دیتی ہے۔ اسے سوچ و فکر میں مبتلا رکھنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتی ہے۔ یوں روز بروز اس کی مشغولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور نازلی بے عملی کی دنیا سے نکل کر ایک نئی زندگی کی راہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

افسانہ ’تین چہرے تین آوازیں‘ بیگم صالحہ کی آپ بیتی ہے۔ افسانہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پوری کہانی ان کے دل کی آواز ہے اور ان کی نظریاتی عمل پر مبنی ہے۔ اس کے باوجود یاس و محرومی، نامرادی و ناکامی موصوفہ کے مقدر کا حصول ہے۔ ان کے لاشعور میں تین چہرے تین آوازیں ماں، بچہ اور محبوب کا تصور بہ آواز تثلیث کی شکل میں جلوہ گر ہے:

”میں تیری ماں ہوں۔“

”میں تیرا بچہ ہوں۔“

’میں تیرا محبوب ہوں۔“

یہی تین چہرے ان کے ذہنی کشمکش اور شبستان فکر میں شامل ہیں۔(۹)

افسانہ ’ہمہ داغ داغ‘ نسوانی زندگی کا المیہ ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ مردوں کے بالمقابل عورتیں زیادہ حساس اور جذباتی ہوتی ہیں۔ ان کے اندر صبر و ضبط کی کمی ہوتی ہے۔ عورتوں کا دل کسی غیر متوقع انہونی معاملات پر کانپ جاتا ہے۔ ان کا رُواں رُواں لرزنے لگتا ہے۔ یہ سارے وجوہات ان کے قدموں کی لغزش کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے میں معدودے چند ایسی بھی نسوانی کردار موجود ہیں جن سے کارخانہ کائنات کے کاروبار اپنے راستے پر گامزن ہیں۔ جو پختہ عزم، مصمم ارادہ اور عقیدت و ایمان کی دولت سے خود کو مالا مال رکھتی ہیں۔ نازک اور نامساعد حالات میں ان کے قدم لڑکھڑاتے نہیں ہیں۔ بلند حوصلے، ہمت اور جذبے کے ساتھ مشکلات کا سامنا کرتی ہیں۔ اپنے حوصلے سے ہزاروں صدموں کو برداشت کرتی ہیں اور سامنے والے کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ ان کے اوپر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ چکا ہے۔ ان کے دل پر لگے زخم ہر لمحہ نئے نئے روپ میں زندگی کا تعین کرتے ہیں۔ لہٰذا مصنفہ کو اپنا داغدار دل بہت پیارا ہے۔ اسی سے وہ روشنی حاصل کرتی ہیں۔

”مجھے اپنا داغ دار دل بہت پیارا ہے۔ یہ داغ تو میری زندگی کے روشن چراغ ہیں۔ میری زندگی ہیں۔......“(۱۰)

افسانہ ’جذبہ معصوم‘ انسانی زندگی کے لاشعور میں چھپے معصوم جذبے کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا کردار ایک بزرگ آدمی ہے۔ جو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ان سبھی خواہشوں کا متمنی ہے جو ایک حس مزاح شخص کی طبیعت کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ نفیس نظریں، شیریں احساسات، نازک لبوں پر تبسم، بچوں کا قرب، ان کی توتلی بولیوں سے محبت ان سے کھیلنا اور گلے لگانا انھیں قوت زندگی کا احساس دلاتے ہیں:۔

آج یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کی کتنی زبردست خواہش اور زندگی کی واحد مسرت رہ گئی ہیں۔ یہ سب اب اس کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں، ان کی باتوں پر وہ خوش ہوتا ہے، اس کی ہنسی پر اس کے بے رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ وہ شفیق اور گمبھیر مسکراہٹ جو اس کے چہرے کو ایک عجیب دلکشی بخشتی تھی۔۔۔۔ ان کا قرب اس کو تقویت کا احساس دلاتا ہے؟ اور بے بسی اور مجبوری کی یہ کیفیت دم بھر کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔۔(۱۱)

’جذبہ معصوم‘ اور ’ہمہ داغ داغ‘ ایک ہی قبیل کے دو افسانے ہیں۔ جو انسانی اور نسوانی زندگی کا المیہ پیش کرتے ہیں۔ افسانہ ’بیکار سامان‘ ترقی پسند زمانے کی سچی کہانی ہے۔ اس کہانی میں بزرگ ماں باپ کو بچے اپنی گوناگوں مصروفیات اور ترقی کی چاہ میں ان کی خدمت اور دلجوئی کو پریشانی کا سبب مانتے ہیں اور بے کار سامان تصور کر کے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ لمحہ فکریہ ہے کہ یہ اخلاقی تعلیم و تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اس میں کہیں نہ کہیں والدین کی کمی بھی شامل حال ہے۔ افسانہ ’وقت وقت‘ بھی اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔ غیر صالح اولاد کس طرح ماں کی روح کو اذیت دیتا ہے۔ مگر وقت ایک ایسا سلسلہ ہے جس کے حصار میں خوشی اور غم کے لمحات موجزن ہوتے ہیں۔ ایک ہی پل ایک شخص کے لئے موسم بہار کی لذت دیتا ہے۔ دوسرے کے لئے موسم خزاں بن کر اسے ٹھیس پہنچاتا ہے۔ البتہ وقت کبھی جبار کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو کبھی حریر و پرنیاں کی شکل میں پھسلتا جاتا ہے۔

افسانہ ’دل دل‘ عورت کی زندگی پر مشتمل کہانی ہے۔ اس میں ایک لڑکی ویسے شخص کے ساتھ شادی کرتی ہے جس کے پاس پہلے سے بیوی بچے موجود ہیں۔ اصل میں وہ یہ شادی اپنے گھر والوں کے نفرت آمیز رویے کے انتقام کے لیے کرتی ہے۔ لیکن شادی کے بعد بھی اس کی حالت نہیں بدلتی ہے۔ پہلے وہ اپنے گھر والوں کے رویے سے بیزار تھی اور اب دنیا والوں کی طعنہ زنی سے پریشان ہے۔ خود اس کی اور اس کی سوت دونوں کی زندگی میں کرب ہی کرب ہے۔ دراصل اس کہانی میں عورت کی زندگی کو کرب کے مانند بتایا گیا ہے۔

افسانہ ’نراس میں آس‘ صالحہ عابد حسین کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ افسانہ مصنفہ کی ذاتی زندگی پر مبنی ہے۔ بیگم صالحہ کے بچپن کی جرأت مندانہ قدم قابل رشک حرکات و سکنات، مطالعہ کتب کے ذوق و شوق اور تحریری صلاحیت کے سبب خاندان کی دیگر خواتین سے منفرد وجود کی مالک رہی ہیں۔ اس کے پس پشت ان کا گھریلو ماحول ہے۔ ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ نئی پرانی سبھی طرح کی کتابیں ان کی الماریوں میں موجود ہوتی تھیں اور فرصت ملتے ہی وہ ان کتابوں کے مطالعے میں منہمک ہو جاتی تھیں۔

سچ پوچھئے تو انسانی زندگی کی رفتار ایک سی نہیں ہوتی ہے۔ فطری طور پر اس میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے اس اتار چڑھاؤ سے مصنفہ بھی مبرا نہیں ہیں۔ ان کی زندگی بھی مختلف طرح کے پیچ و خم، نشست و برخاست اور عروج و زوال سے نبرد آزما رہی ہے۔ انہوں نے فطرت کے غیظ و غضب کو سیلاب کی صورت میں دیکھا تھا۔ اس کی تباہی و بربادی کو قریب سے محسوس کیا تھا۔ آزادیٔ ہند کے معرکے، تقسیم ہند کا المیہ اور اولاد کے نہ ہونے کا غم جیسے موضوعات اس کہانی میں زیر بحث آئے ہیں۔ یہ سارے نکات فطرت انسانی کو ہراساں کرتے ہیں اور نراسا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ہمارے سماج میں اس طرح کے واقعات ہر دن رونما ہوتے ہیں۔

کسی بھی فن پارے کا خالق سماج کا ایک ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔اس کے سامنے سماج کے مختلف مسائل ہوتے ہیں۔وہ طرح طرح کے چیلنجز کا سامنا کرتے ہیں۔ایسی صورت میں وہ ان مسائل کے منفی نتائج کو درکنار کرتے ہوئے مثبت اور تعمیری شکل دینے کی کوشش کرتا ہے اور ایک کارآمد سماج کی نیو ڈالتا ہے۔صالحہ عابد حسین بھی ان مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ان مسائل کا مداوا وہ پڑھنے لکھنے، شہرت اور ناموری سے جوڑ دیتی ہیں۔جس سے قاری کے اوپر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔صالحہ عابد حسین کا انفراد واختصاص ہے کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں پر ادب کو فوقیت دیتی ہیں۔جب ایک ہندوستانی عورت ادب لکھ رہی ہوتی ہے اس کے آگے ہزاروں جھمیلے، خاندانی جھگڑے، مالی پریشانیاں، بیماریوں کی مصیبت وغیرہ راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔پھر بھی وہ یہ کہنے پر اصرار کرتی ہیں:

”آخر اس کی یہ ساری تصانیف اس کی اولاد نہیں تو کیا ہیں؟ اولاد سے آخر ماں کیا توقع کرتی ہے نام چلنے کی؟ کیا اس کی تصانیف اس کا نام باقی نہ رکھیں گی؟ رفاقت کی؟ کیا کتابوں سے بڑھ کر کوئی رفیق ہوسکتا ہے؟ بڑھاپے اور مصیبت میں دستگیری کی؟ مالی منفعت کی؟ کیا اس کی کتابیں اسے یہ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں؟ کیا اس لیے کہ نیک اور سعادت مند اولاد ماں کی شہرت اور عزت کا باعث ہوتی ہے؟ تو کیا اس کی یہ اولاد معنوی قدر کے قابل ہوئی تو اسے عزت وشہرت سے مالا مال نہیں کرسکتی؟ پھر آخر وہ کیوں اپنے کو محروم اور بدنصیب سمجھے؟“ (۱۲)

افسانہ'تجدید الفت'ایک شادی شدہ نئے جوڑے کے کھٹے میٹھے تجربات کی کہانی ہے۔پہلے پہلے نیا جوڑا سہیل اور نصرت ایک دوسرے پر جاں نثار کرتے ہیں۔سہیل پڑھا لکھا تعلیم یافتہ نوجوان ہے، جس کا تعلق ایک اچھے فارغ البال خاندان سے ہے۔اس کی بیوی خوبصورت وضع قطع کی کم پڑھی لکھی متوسط گھرانے سے ہے۔نصرت ضدی اور دقیانوسی اصول کی پابند ہے۔اس کے فرسودہ خیالات اور مزاج کا الھڑ پن خوشحال ازدواجی زندگی کے درمیان خلل پیدا کرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے دور رہنے لگتے ہیں۔کچھ دنوں کی جدائی کے بعد سہیل اور نصرت پرانی یادوں کے سہارے جی رہے تھے۔ان دونوں کی محبت کے درمیان ضد اور ہٹ دھرمی جیسی ناپاک عنصر حائل تھی جو محبت کے قدردانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔

ریحانہ نامی ایک عورت نصرت کی اچھی دوست ہے۔نصرت سے ریحانہ کی ملاقات کشمیر گھومنے کے درمیان ہوئی تھی۔نصرت زندگی کی یکسانیت سے گھبرا کر اپنی دوست ریحانہ کو بذریعہ خط اپنے حالات سے آگاہ کرتی ہے۔ریحانہ اس کی طبیعت کا خیال کرتے ہوئے کشمیر بلا کر خاطر خواہ اس کا علاج اور صحت کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ریحانہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے تجربات سے نصرت کو آگاہ کرتی ہے اور سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی اور نصرت کے ذہن سے وہ سارے فرسودہ اور دقیانوسی خیالات کو یہ کہہ کر ختم کردیتی ہے:

پھر یہ تو سوچو گناہ تو سب ہی برے ہیں۔عورتیں ایک دوسرے کی غیبت کریں، حق تلفی کریں، شوہر کی برائیوں کا ہر ایک سے رونا روئیں۔اپنا مزاج خراب کرکے اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کردیں۔دوسروں کا دل دکھائیں یہ سب روا اور ثواب اور اگر شوہر کا کہنا مان کر اپنے گھر کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کوئی خاص لباس پہن لیا جائے۔کسی خاص طرح سے سنگار کرلیں یا دو چار سے پردہ توڑ دیں تو فوراً دوزخ کے دروازے کھل جائیں گے۔مان لیا کہ یہ گناہ ہے لیکن میاں کا دل دکھانا، سب سے جھگڑنا اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی خراب کرنا اور اسی قسم کے دوسرے نتائج جو نااتفاقی سے پیدا ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر گناہ ہیں۔(۱۳)

بیگم صالحہ عابد حسین کی کہانیاں ہمدردی کا دوسرا نام ہے۔دوستی، خلوص، اپنائیت، ہمدردی، فیاضی، جفاکشی کی جتنی رنگیں ہیں ان سبھی رنگوں کا پرتو ان کے افسانے ہیں۔ان کے افسانے وفاداری اور انسانیت کا پیغام دیتی ہیں۔افسانہ نگار کے اس روادارانہ خوبی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک متوسط طبقے کی رکن ہیں۔اس بات کا اشارہ ان کے افسانوں میں جا بجا ملتے ہیں۔افسانہ'زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا' میں لکھتی ہیں:

”وہ ذرا دیر دروازے پر کھڑی اس مختصر گھر کی یہ بھرپور زندگی رشک کے ساتھ دیکھتی رہی۔۔۔وہ لاکھ کہے۔۔۔مگر میں اسے خوش قسمت اور مسرور ہی سمجھتی ہوں۔۔غریبی ہیں، محرومیاں ہیں، مشکلیں ہیں۔۔۔۔مگر ان سب میں محبت کی گرمی ہے، جدوجہد کی مسرت ہے۔۔۔اپنائیت کا احساس ہے۔۔۔۔ خلوص کا رنگ ہے۔اور اسے برسوں کا چھوڑا اپنا میکے کا گھر یاد آگیا۔“ (۱۴)

صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا پلاٹ مضبوط اور گٹھا ہوتا ہے۔ان کے موضوعات زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں۔وہ کردار سازی بھی خوب کرتی ہیں۔مگر ان کی کہانیوں میں کردار بہت کم پائے جاتے ہیں جو بھی ہوتے ہیں ان کے اسماء کی ظاہرداری سے بھی کتراتی ہیں شاید اس کی وجہ وہ خود ہیں۔ان کی زبان صاف اور رواں ہے۔گرچہ ان کا بیانیہ اسلوب بدرجہ اتم نمایاں ہے۔وہ تاریخی مقامات، تاریخی عمارتوں کا ذکر نہیں کرتی ہیں۔وہ محلوں ایوانوں اور خوبصورت فضاؤں کا سیر نہیں کراتی ہیں۔وہ چاند ستاروں کا گیت نہیں سناتی ہیں۔ان کے متعلق کتاب نما کے خصوصی شمارہ کے اداریہ میں لکھا ہے:

”انھوں نے اپنا رشتہ زمین سے استوار کیا اور اپنی تحریروں میں عام انسانوں کے دکھ، درد، خوشیوں، کامیابیوں، ناکامیوں کو سیدھے سادے انداز سے بیان کیا۔“(۱۵)

مختصر یہ کہ جس درجے کا تجربہ اور مشاہدہ بیگم صالحہ عابد حسین کو حاصل تھا اس کی بہتر مثال ان کے افسانے ہیں۔

حواشی

(۱) یادگار حالی از صالحہ عابد حسین، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲
(۲) کتاب نما (صالحہ عابد حسین نمبر)، عزیز قریشی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳
(۳) افسانہ'بلا' مشمولہ: نونگے (افسانوی مجموعہ) از صالحہ عابد حسین، ادارہ انیس اردو، الہ آباد ۱۹۵۹ء، ص ۷۵
(۴) افسانہ'ہمدرد' مشمولہ: نونگے (افسانوی مجموعہ) صالحہ عابد حسین، ادارہ انیس اردو، الہ آباد ۱۹۵۹ء، ص ۱۴۴
(۵) افسانہ'ہمدرد' مشمولہ: نونگے (افسانوی مجموعہ) صالحہ عابد حسین، ادارہ انیس اردو، الہ آباد ۱۹۵۹ء، ص ۱۳۷
(۶) افسانہ'ایک عالم ہے اسی رنگ میں' مشمولہ: نونگے صالحہ عابد حسین، ادارہ انیس اردو، الہ آباد ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۹
(۷) افسانہ زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۹
(۸) افسانہ زندگی نام ہے مرمر کے جیے جانے کا، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۶
(۹) افسانہ تین چہرے تین آوازیں، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۱، ۱۰۲
(۱۰) افسانہ ہمہ داغ داغ، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۸
(۱۱) افسانہ'جذبہ معصوم' مشمولہ: تین چہرے تین آوازیں، صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸
(۱۲) افسانہ'نراس میں آس' از صالحہ عابد حسین، کتب پبلشرز لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۸ء، ص ۸۱
(۱۳) افسانہ'تجدید الفت' مشمولہ: سازہستی (فسانوی مجموعہ) صالحہ عابد حسین، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی ۱۹۴۶ء، ص ۱۲۱
(۱۴) زندگی نام ہے مرمر کے جیے جانے کا از صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷
(۱۵) ماہنامہ کتاب نما خصوصی شمارہ، صالحہ عابد حسین نمبر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۵، ۶

❑❑❑

ڈاکٹر علی اصغر

برہم پترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

9968616032

الطاف حسین عالم لکھنوی کی فارسی شاعری

ہندو ایران کے باہمی روابط ایک طویل زمانے سے رہے ہیں۔ ادبی، زبانی وتہذیبی ادبا،علما اور افاضل وشعرا کی لمبی فہرست ہے ۔جنہوں نے بوستان ہند میں فارسی زبان وادب کی گل کاری کی۔ یہاں کی نم ناک زرخیز مٹی سے ایسے عبقری فارسی شعرا اٹھے جنہوں نے فارسی دنیا میں اپنی شعری اورادبی حیثیت کو باور کرایا۔عبداللہ روزبہ نکتی ،ابوالفرج رونی،مسعود سعد سلمان،امیر خسرو،فیضی اور مغل دور کے اواخر میں بیدل اور غالب یہ وہ متاثر کن شخصیات تھیں جن کی شعری استادیت، عالمانہ نبوغت، ادبیانہ مہارت اور بے مثال عبقریت نے صدیوں اور قرنوں کو اپنی تاثیرزا اور سحرانگیز خیز شعری اسلوب میں جکڑے رکھا۔آج بھی مذکورہ بالا شعرا کی تاثیر اندازی میں فرق نہیں آیا۔

یوں تو بہت کم عرصے میں فارسی زبان وادب پورے ہندوستان میں چھا گیا تھا اور بہت سارے ادبی اور تہذیبی مراکز استوار ہوتے چلے گئے تھے۔لیکن ان تمام ادبی مراکز میں خطہ اودھ کو ایک امتیازی اعتبار حاصل رہا۔جس وقت مغلیہ سلطنت اپنی زندگی کی آخری اکھڑتی سانسیں برقرار رکھنے میں لڑکھڑا رہی تھی۔اس وقت دیگر ادبی صوبوں کو طرح اودھ میں فارسی زبان وادب، اپنے رعنائی کے دن دیکھ رہا تھا۔

> ”صوبہ اودھ میں جو حکومت صحیح معنوں میں پوری طرح برسر اقتدار آئی تھی، اس کا سلسلہ نواب سعادت خاں برہان الملک سے شروع ہو کر واجد علی شاہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دور اقتدار تقریباً ڈیڑھ سو برس (۱۱۳۴ تا ۱۲۷۳ھ۔ ۱۷۲۱تا۱۸۵۶ء) تک قائم رہا“

(اودھ کے فارسی گو شعرا، ڈاکٹر زہرہ فاروقی ،ص ۲۳)

اودھ میں تقریباً گیارہ ادب نواز حکمراں گزرے لیکن ان کے دور اقتدار میں نہ جانے کتنے ادبا،شعرا اور علما اور افاضل تھے،اس کا شمار کرنا تقریباً ناممکن ہے۔عددی اعتبار سے، فارسی زبان وادب کی حمایت وترویج کا زمانہ اگرچہ ۱۷۲۱ء سے لیکر ۱۸۵۶ء تک محدود ہے لیکن اس مختصر عرصے میں فارسی ادب نے خطہ اودھ کے باشندوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ سرکاری معاونت وحمایت کے خاتمے کے باوجود بھی ،فارسی زبان وادب کی توسیع وپیش رفت میں اضمحلال کے عناصر تقریباً مفقود اور معدوم نظر آتے ہیں۔

سلطنت اودھ کے خاتمے کے بعد بھی مجتہدانہ ذہن کے حامل فارسی شعرا کی کہی کہکشائیں، ادب کے قاری کی نگاہیں خیرہ کرتی ہیں۔ انہیں میں ایک نام میرزا الطاف حسین عالم لکھنوی کا بھی ہے۔ان کی قادر الکلامی اور عبقریت نے انہیں ”لسان الزمن“ کا خطاب دلایا۔ان کا ایک فارسی کلام کا مجموعہ ”قند آب عجم“ ہے جسے انہیں کے خلف الصدق سید میرزا محمد یوسف نے ۲۰۰۱م میں ترتیب دے کر شائع کیا۔اس مجموعہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ”زیر نظر مجموعہ عالم لکھنوی کی عربی وفارسی کلام پر مشتمل ہے۔جس کی ترویج وانشراح کا سلسلہ،اردو شاعری کے ساتھ شروع ہوا اور آخری عمر تک جاری رہا۔خصوصاً ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۶۷ھ تک اردو میں کہنا چھوڑ دیا تھا صرف فارسی ہی میں کہتے رہے“

(قند آب عجم، ص ۱۶)

یہ افسوسناک پہلو ہے کہ مرتب کو صرف چند کلام ہی میسر ہوئے باقی کلام جو ایک معتدبہ حصے پر مشتمل تھا ضائع ہو گیا۔لیکن بہر حال جو ہے وہی غنیمت ہے۔ ان چند غزلوں، قصیدوں، ترکیب بندوں اور قطعات سے ہی میرزا عالم لکھنوی کی استادیت اور نبوغت شعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ فارسی مجموعہ چند نثری حصوں اور اشعار پر مشتمل ہے۔ابتدا میں نثری حصے میں میرزا عالم کی کتاب ”ادبیات النافذ“ کا وہ حصہ شامل ہے جس میں ان کے حالات زندگی تحریر ہیں۔اس کے بعد شادی اور مجالس چہلم کی مناسبت سے کچھ فارسی رقعے نقل کئے گئے ہیں۔

> ”مولانا میرزا مہر علی نے آخر حیات میں اصفہان کا سفر کیا۔ جہاں ایران کے معروف مجتہد اور عالم آخوند حاجی علی شیرازی کی دختر سے نکاح کیا۔لکھنؤ مراجعت کے بعد ان سے دو فرزند پیدا ہوئے حکیم میرزا علی اور میرزا محمد مہدی معروف بہ آغا میرزا۔ آغا میرزا ہمارے زیر بحث شاعر کے والد ہیں۔اندازہ کیا جا سکتا ہے میرزا عالم لکھنوی کو قسمت نے کس علمی خانوادے کا چشم و چراغ بنایا تھا۔گھر کی زبان۔ فارسی اور اس پر طرّہ یہ کہ فارسی شاعری، امرا اور اشراف کا وسیلۂ اظہار تفاخر تھا۔ بدیہی طور پر یہ وہ عوامل تھے جس نے میرزا عالم کو فارسی شاعری اور خاص طور سے قصیدہ نگاری میں کئی ایسے تجرباتی انکشافات سے گذارا جو اس سے قبل فارسی دنیا میں کلی طور پر نامعلوم تھے۔جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ انہوں نے فارسی غزلیات کے عنوان سے ایک معتدبہ حصہ بطور یادگار چھوڑا لیکن دستبرد زمانہ کی ستم ظریفیوں سے ۱۶؍ غزلیں ہی محفوظ رہ سکیں۔“

شعری حصے میں ۱۶ غزلیات، ۶ قصائد، ایک دوازدہ بند اور کتاب کے آخری حصے میں کچھ تاریخی قطعات ہیں۔ خوشی کے مناسبت سے ۱۶ قطعات اور وفات کے ۱۳۰ تاریخی قطعات نقل کئے گئے ہیں۔

مرتب کتاب نے میرزا عالم لکھنوی کا پورا نام "میرزا الطاف حسین" بتایا ہے اور شاعر نے اپنے لئے "عالم" تخلص منتخب کیا۔ ولادت ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء ہے۔ میرزا عالم "نافذ" میں تحریر کرتے ہیں کہ

"عمر بندہ چہاردہ سالہ بود در ہمان عمر یک قطعۂ تاریخ از جیب فکر برآوردم"

میرزا عالم نے چودہ سال کی عمر میں ایک قطعۂ تاریخ لکھا جس کا آخری مصرع یہ ہے جس سے ان کے چچا نافذ لکھنوی کی تاریخ مولوی حکیم میرزا علی متخلص بہ نافذ ۱۳۱۴ھ وفات برآمد ہوتی ہے۔

بی سرو پا این ہمہ گشتند در رنج فراق
علم وفضل و رتبہ و دین وفنون و خیر و ہوش
۱۳۱۴ھ

ان میں مستعمل اوسط الفاظ سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، اسی کتاب کے آخر میں نافذ لکھنوی کے سانحۂ ارتحال کی ایک اور تاریخ ہے جس میں قرآنی الفاظ سے مادۂ وفات برآمد کیا ہے۔

خواست چون ذہن رسای عالم شرین سخن
سال فوتش آمد از قرآن "لکم اجر عظیم"
"۱۳۱۴ھ"

ظاہر ہے کہ اگر ۱۳۱۴ھ میں سے چودہ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳م) نکلتے ہیں جو میرزا عالم کی مستند تاریخ ولادت ہے۔ میرزا الطاف حسین عالم لکھنوی نے ایک ایسے علمی اور ادبی خانوادے میں آنکھ کھولی، جہاں کی فضا میں علم وادب اور فقہ واصول کی خوشبو رچتی بستی تھی۔ آپ کے جد امجد علامہ طاہر اصفہانی، تبادلۂ آب وہوا کی غرض سے کشمیر کی شاداب زمین پر وارد ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خانوادہ کشمیری خانوادے" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ خود میرزا عالم رقمطراز ہیں کہ:

"مولانای ممدوح را بہ این وجہ کاشمیری می گویند کہ حضرت معین الشریعہ مولانا میرزا طاہر ناخوش شد واز اصفہان بہ غرض تبادلۂ آب وہوا وارد خطۂ کشمیر گردید"
(نافذ: قند آب عجم، ص ۲۱)

یہاں کی آب وہوا انہیں موافق محسوس ہوئی لہٰذا کشمیر میں ہی مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ اور یہیں پر معتمد الشریعہ میرزا اعون کی ولادت اور تربیت ہوئی۔ میرزا اعون اپنے وقت کے زبردست عالم ربانی اور بے نظیر فقیہہ کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کے فرزند حضرت علامہ میرزا اسماعیل نے بھی علوم عقلی ونقلی میں کمال تجر پیدا کیا۔ آپ کی علمی اور روحانی خصوصیات کا شہرہ بن کر محمد غازی الدین حیدر بادشاہ (۱۷۶۹ء - ۱۸۲۷ء) نے آغا میر بہادر نواب معتمد الدولہ کے توسط سے کشمیر سے لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ میرزا عالم لکھتے ہیں کہ

"حضرت ظل سبحانی ثریا جاہ مرزا محمد غازی الدین حیدر پادشاہ اودھ، غائبانہ برصفات وکمالات آن عالی جناب فریفتہ شدو بتوسط نواب معتمد الدولہ آغا میر بہادر از کشمیر بدار السلطنت خود کہ از لکھنو موسوم است، طلبید وسہ صد روپیہ ماہانہ برایش معین فرمود"

(نافذ، ص ۲۲، قند آب عجم)

علامہ میرزا اسماعیل کے لکھنؤ آنے کا سال تلاش بسیار کے باوجود بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ میرزا عالم نے کتاب النافذ میں اپنا شجرہ نسب بیان کیا ہے لیکن سوائے اپنے چچا نافذ لکھنوی کے کسی کی بھی تاریخ وفات کبھی اور نہ ہی درج کی ہے۔ شاید وہ خود اس بات سے ناواقف تھے۔ باوجود اس کے کہ تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل کیا تھا پھر بھی تاریخ قطعہ وفات نہ کہنا اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ دوسرے کلام کی طرح یہ بھی ضائع ہو گیا ہو۔ لیکن تاریخ النافذ کی موجودگی میں یہ بھی قرین قیاس نہیں لگتا۔

علامہ میرزا اسماعیل کے فرزند مولانا میرزا مہر علی نے اپنے والد ماجد سے جملہ علوم ظاہری و باطنی کا اکتساب کیا۔ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج میں یہ خانوادہ آباد ہوا۔ یہیں پر مولانا میرزا مہر علی نے نواب مدار الدولہ کی دختر سے نکاح کیا۔ جس سے مولانا میرزا محمد علی پیدا ہوئے۔ آپ حضرت سید العلما علیین مکان (۱۲۷۳ھ) کے خاص شاگردوں میں سے ایک تھے۔ آپ کی علمی اور فقہی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بادشاہ اودھ نے آپ کی علمی جلالت کے پیش نظر "قائمۃ الدین" کا خطاب عطا کیا تھا۔

میرزا عالم کے بقول۔ مولانا میرزا مہر علی نے آخر حیات میں اصفہان کا سفر کیا۔ جہاں ایران کے معروف مجتہد اور عالم آخوند حاجی علی شیرازی کی دختر سے نکاح کیا۔ لکھنؤ مراجعت کے بعد ان سے دو فرزند پیدا ہوئے حکیم میرزا علی اور میرزا محمد مہدی معروف بہ آغا میرزا۔ آغا میرزا ہمارے زیر بحث شاعر کے والد ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے میرزا عالم لکھنوی کو قسمت نے کس علمی خانوادے کا چشم و چراغ بنایا تھا۔ گھر کی زبان۔ فارسی اور اس پر طرّہ یہ کہ فارسی شاعری، امرا اور اشراف کا وسیلۂ اظہار تفاخر تھا۔ بدیہی طور پر یہ وہ عوامل تھے جس نے میرزا عالم کو فارسی شاعری اور خاص طور سے قصیدہ نگاری میں کئی ایسے تجرباتی انکشافات سے گذارا جو اس سے قبل فارسی دنیا میں کلی طور پر نامعلوم تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ انہوں نے فارسی غزلیات کے عنوان سے ایک معتد بہ حصہ بطور یادگار چھوڑا لیکن دستبرد زمانہ کی ستم ظریفیوں سے ۱۶ غزلیں ہی محفوظ رہ سکیں۔ اس سے غزل گوئی کے اسلوب وسبک کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے کیونکہ جو کچھ بچا ہے ان میں اکثر اساتذہ قدیم کی صدائے بازگشت ہے۔

حصۂ غزلیات:

ہم سب سے پہلے ان کی غزلیات کا ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ مہارت کلام کس درجہ کی ہے۔ فارسی شاعری میں شعرا نے اظہار مفخرت اور تفاخر کا مضمون کئی انداز سے باندھا ہے۔ یہ انداز گفت وگو ہمیں ان کے کلام میں بھی کئی جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں کہ میں شعری دنیا میں ایک ذرے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن تیری محبت کے صدقے آج ذرے سے آفتاب بن چکا ہوں:

زمہر تو، بہ فن نظم لا جواب شدم
کہ ذرہ بودم و امروز آفتاب شدم

اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ میرزا عالم نے شعوری طور پر اساتذۂ کلام سے اخذ واستفادہ کیا ہے اور ساتھ میں جہاں فخریات کے اشعار ہیں وہیں اس بات کا اعتراف بھی ہے یہ اساتذہ کے باغ وگلستان شعری کی اجتماعی خوشبو ہے۔

آوردہ ایم پیش تو گلدستہ حسین
گلہائے رنگ رنگ زگلزار چیدہ ایم

اور یہ صرف بطور تعظیم نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ہمیں کئی مقامات پہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو اساتذۂ کلام کے مضمون پہ مشتمل ہیں۔ مثلاً میر تقی میر کا مشہور اور زبان زد شعر ہے کہ

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اس شعر کے مضمون کو میرزا عالم نے بھی باندھا ہے اگر چہ جہات معنی کے اعتبار سے میر تقی میر کا شعر کئی اعتبار سے بلند ہے۔ جبکہ میرزا عالم کا شعر گہرا کہرے معنی پر مشتمل ہے۔

بہ سعی گشت ہمہ پارہ ہای دل یک جا
ہزار شکر کہ من صاحب کتاب شدم

لیکن ایک اعتبار سے بہرحال میر کے شعر پر یہ شعر تفوق رکھتا ہے کہ میر کا دیوان "درد وغم" سے

جمع ہوا ہے جبکہ میرزا عالم نے ”پارہ ہای دل“ کہہ کے میر سے ایک قدم آگے رکھنے کی کوشش کی ہے۔میرزا عالم کے کلام پر۔غالب کے کلام کی گہری چاپ نظر آتی ہے۔لکھنؤ دبستان میں غالب کے شعری دیوان کا گرم جوشی سے استقبال ہوا تھا۔بہت سے شعرا نے ہمیشہ میرزا غالب کے کلام کو ہی پیش نظر رکھ کے اشعار کہے ہیں۔اس فہرست میں جہاں ثاقب لکھنوی اور بیخود موہانی کا نام آتا ہے وہیں میرزا عالم کا بھی نام دیکھنے کو ملتا ہے۔غالب کی مشہور غزل ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اسی بحر میں میرزا نے گویا غالب کے چند اشعار کا ترجمہ کر دیا ہے۔

صورت کار بر نمی آید
سحر امشب نظر نمی آید

لیکن دقت اور غور کرنے پر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ یہ اگرچہ ترجمہ ہے لیکن ”ترجمۂ محض“ نہیں ہے بلکہ اس میں بھی تخلیقی توسیع کارفرما ہے۔غالب اپنی غزل میں کسی ”صورت“ کے دید کے منتظر ہیں لیکن انہوں نے نہایت سادگی کے ساتھ بغیر استعارہ و تشبیہہ کے بات کہی ہے لیکن میرزا عالم نے ”سحر“ کو بطور استعارہ استعمال کر کے اس ترجمہ کو ایک مستقل شعری حیثیت عطا کر دی ہے غالب کہتے ہیں کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
میرزا عالم کہتے ہیں
در چنین جایی قصد می دارم
کہ از آن جا خبر نمی آید

غالب ہندوستان کا وہ عظیم شاعر ہے جس کی شعری اقتدا ایک عالم نے کی۔خاص طور سے سرزمین اودھ میں غالب اور ان کی شاعری کی دھوم مچی اور شعرائے اردو و فارسی نے ان کی زمین، قافیہ اور ردیف میں شعر کہے۔اور یہ تتبع و پیروی کی انتہا یہ ہے کہ غالب کے خیالات و افکار اور مضامین و تراکیب بھی لکھنؤ کے شعراء کے منظور نظر رہے۔عالم لکھنوی نے نہ صرف غالب کی زمین پہ غزلیں لکھیں بلکہ بعض اوقات شعری مضامین کی بندش میں غالب کی فکری کائنات سے بھی بہرہ گیری کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً غالب کہتے ہیں۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

اور عالم لکھنوی فرماتے ہیں

این توقف نہ بی سبب باشد
از کہ پرسم چہ وجہ تاخیرست
صفحہ ۵۰

عالم لکھنوی کی شعری کائنات کا خمیر عشق، درد اور کیفیت و حالات سے گوندھا گیا ہے۔ہر شعر کے تار و پود میں عشق و محبت کا خون ہے۔کیونکہ عالم کی باخبر و باحال نظر شیراز کے عاشق شاعر حافظ شیراز کے مضامین و تراکیب سے نا آشنا نہ تھی۔اس لئے ان کے کلام میں جا بجا حافظ کے شعری مضامین کی چھاپ نظر آتی ہے۔حافظ کہتے ہیں:

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بہ نام من دیوانہ زدند

اور عالم لکھنوی کہتے ہیں:

روز ازل کسی چو نبرداشت این جبل
بار امم کشید دل ناتوان ما
(صفحہ ۴۰)

ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ انہوں نے متقدم شعراء اور اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے۔کیونکہ زیر بحث مجموعہ کلام میں بکثرت ایسے شواہد موجود ہیں۔اساتذہ کے کلام کی پیروی اور استقبال کی روایت شاعری کی دنیا میں ایک مضبوط روایت رہی ہے۔لیکن عالم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ متقدمین کے ”مقلد محض“ نہیں بلکہ ان کے مضامین جدیت اور نیا پن بڑی تازگی اور مہارت سے پیش کرتے ہیں۔خیام نیشاپوری ایک ایسا شاعر ہے جس کی تقلید میں ہزاروں شعرا نے کلام و رباعیات لکھیں۔لیکن اس میں نیا اسلوب و آہنگ تو کجا تقلید بھی واقعی کلمہ کے معنی میں نہ ہو سکی۔مثلاً خیام کی یہ درج ذیل رباعی دیکھیں اور پھر عالم لکھنوی کے مجتہدانہ شعری اسلوب اور طرز کو ملاحظہ کریں:

برخیز و بیا بتا برای دل ما
حل کن بہ جمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ شراب تا بہم نوش کنیم
زآن پیش کہ کوزہ ہا کنند از گل ما

مذکورہ مضمون کو عالم لکھنوی نے عجیب لطف و کیفیت کے ساتھ باندھا ہے۔خیام کے فلسفیانہ خیال کو انہوں نے سادگی کے ساتھ عشقیہ عنوان دے دیا ہے:

نرفت الفت مئی ہم ز دل پس مردن
کہ بعد خاک شدن، کاسۂ شراب شدم
(صفحہ ۴۸)

ایسی اجتہادانہ شان کے ساتھ اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو بالکل بجا ہے

زمہر تو بہ فن نظم لاجواب شدم
کہ ذرہ بودم و امروز آفتاب شدم
(صفحہ ۴۸)

وہ بحر عشق کے رموز کے شناور ہیں لیکن بقول خیام ”معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد“ کے بھی طرف دار ہیں۔غزلیات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے یہ عشق و حقیقی ہے جو انہیں بار بار حال سے دوچار کرتا ہے۔وہ فرقت میں نالہ بر انداز تو ہیں لیکن باب استجابت کے وا ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔

سنگ آب آب شد دل آہن گداختیم
براد اثر نکرد مگر ہائے ہائے ما
(صفحہ ۴۱)

قند آب عجم میں مشمولہ کلام میں کئی جگہ اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ زمانے اور اہل زمانہ کی شکایت بے معنی ہے خلق سے کسی طرح کے ترحم کی امید بے جا ہے۔یہ امید وہ سچا خواب ہے جس کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہے۔

عالم ز اہل خلق، امید کرم مدار
این خواب صادق است کہ بسیار دیدہ ایم
(صفحہ ۵۲)

وہ ”امید کرم“ کو طنزیہ لہجہ میں ”خواب صادق“ کی ترکیب سے واضح کرتے ہیں۔لیکن اہل زمانہ کی ناقدری اور بے مروتی کا کون شکار نہیں ہوا۔عالم نے ایک مکمل اور بلند قصیدہ ”نقض عہد“ کے سلسلے میں تحریر کیا ہے۔آئندہ سطور میں اس پر گفتگو ہوگی لیکن یہاں اس بات کا اعادہ بے جا نہیں کہ

لاکھ فہمائش کے باوجود خود عالم لکھنوی کے کلام میں اہل زمانہ کی ناقدری کا شکوہ ملتا ہے۔

دل را بہ دل رہیست برابر شنیدہ ایم
لاکن ز ''دوستان وطن'' ماچہ دیدہ ایم
یارب کجا رویم وکجا منزلی کنیم
خواہیم از تو رحم کہ ''آفت رسیدۂ ایم

(صفحہ ۵۲)

حصہ قصیدہ:

قصیدہ نگاری، قدیم ایام سے ہی شعرا کی علمی وشعری جولانگاہ رہی ہے۔ یہ وہ ہئیت ہے جس میں شاعر اپنی مہارت، فنی رموز پہ تسلط اور کمال علم کا لوہا منواتا ہے۔ عالم لکھنوی نے بھی قصائد لکھے۔ لیکن دوسرے شعرا کی طرح اہل دنیا اور امراء کی تعریف میں رطب اللسان ہونے کے بجائے دیگر موضوعات کو مرکز نگاہ بنایا۔ وہ دراصل 'مداح امراء' نہیں بلکہ 'ابنائے روزگار' کی تملق سے بے نیاز ہیں۔

مارا بود چہ کار زابنائے روز گار
ماجز خدا ستایش دیگر نمی کنیم

(صفحہ ۵۱)

بہرحال انہوں نے چھ مختلف عنوانات میں قصیدے لکھے ہیں پہلا قصیدہ ''ذم نقض العہد'' ہے دوسرا قصیدہ ''درمدح امیر المومنین'' ہے اس قصیدے میں ۹ بیت ہیں۔ تیسرا قصیدہ بھی ''درمدح المومنین'' ہے جس میں سترہ بیت ہیں۔ ان دونوں قصائد میں قصیدے کے اجزائے ترکیبی موجود نہیں لہٰذا ہم اسے ''مدحیہ کلام'' یا ''سلام'' کے زمرے میں شمار کر سکتے ہیں۔ درحقیقت موردنظر شاعر کے معاصر عہد میں قصیدہ نگاری کے اجرا برتنے کے حوالے سے تنزلی اور انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے اس صنف میں موجود عناصر ترکیبی میں پہلے تو کم رنگی آئی اور معنوی تہہ داری ختم ہوئی بعد میں صوری صورت حال میں کافی حد تک تغیر واقع ہونے لگا۔ حتیٰ کہ مذہبی قصائد محض چند اشعار کا مجموعہ بن کے رہ گئے۔ اس میں نہ زبان واسلوب بیان ملحوظ خاطر رکھا گیا نہ بدیعی اور معنوی زاویے کو اہمیت دی گئی۔

چوتھا قصیدہ ''مدح تاریخ غدیر'' میں تقریباً ۳۸/ ابیات پہ مشتمل ہے۔ پانچواں قصیدہ ''مکالمۂ ملہم غیب'' کے عنوان پہ سوال جواب کی صنعت میں ہے۔ ایک قصیدہ ''گلگونہ پارس'' کے نام سے عالی جناب سید حسن امام تخلص بہ حسنؔ رئیس گیا کی مدح میں ہے۔ مطلع کا آغاز یوں ہوتا ہے:

اکتساب عز وشان از تو نماید آسمان
آفتاب از تو بجوید عز و قدر اقتران

(قند آب عجم، صفحہ ۴۳)

ان قصائد میں فارسی کے مسلم الثبوت اور ماہر فن اساتذہ کی نہ پیروی کی گئی ہے نہ کوئی خاص امتیازی اسلوب پہ مشتمل ہے البتہ پہلا قصیدہ ''ذم نقض العہد'' ایک ایسا بے مثال اور بے نظیر قصیدہ ہے جس کی مثال پوری فارسی ادبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس قصیدے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فن شاعری میں اجتہادانہ صلاحیت ومہارت کے حامل تھے۔

موردنظر قصیدہ، عربی لفظیات اور فارسی تراکیب کے اشتراک سے یوں بُنا گیا ہے گویا یہ بیک وقت فارسی زبان میں بھی ہے اور عربی زبان میں بھی ہے۔ فارسی الفاظ ولغات کو عربی اعراب کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے یہ نمونہ دراصل، ہندوستانی فارسی شعری روایت کا حصہ ہے۔ خاص طور سے لکھنو ادبستان سخن میں اس طرح کے عجیب وغریب تجربات کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک ایسی اردو غزل کہی گئی جو فارسی زبان بھی سمجھ لے۔ یعنی ایک ہی وقت میں وہ غزل، دو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کا مطلع ملاحظہ کریں:

متاع زندگی برباد کردی
رہا بلبل نہ، اے صیاد کردی

معروف ادیب اور فقیہ مفتی محمد عباس شوشتری لکھنوی (۱۳۰۶ھ) نے عربی زبان میں ایک مرصع مثنوی ''جناس الاجناس'' لکھی جس میں صنعت تجنیس کے جملہ انواع واقسام شامل ہیں۔ مذکورہ مثنوی میں بعض فارسی الفاظ کو عربی قواعد کے مطابق تجنیسی صنعت سے برتا ہے۔ میرزا عالم لکھنوی نے اسی تہذیبی روایت کو دیکھا اور تجربہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی انداز کو اپنایا۔ بعض اشعار ملاحظہ ہو:

أَرَاقَت دَمَ العُشّاقِ مِن غَمزَۃِ الچَشم
وزخمی نمودہ قلبُهُم آبَۃَ الزَخم
زند تیرہا مژگانہا فی قُلُوبِهِم
دَأَرَوَاحُهُم قد رفتہ مِن قَالِبِ الجِسم
ہمیشہ ازو ترسند فی القُربِ وَالنَویٰ
کَخَوفِ گنہگارٍ وَخَشیَۃِ ذِی جُرم
غَدَا ابروانش، بہرایشان کمانہا
فَتَرمِیهِم مِنها بِسَهمٍ عَلیٰ سَهم
یہ این تیرہا غربال گشتہ قُلُوبَهم
و سرزد نشد چیزی ازا ایشان مِن الجُرم

(صفحہ ۵۸)

مولانا ابن علی واعظ نے مذکورہ قصیدہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

> یہ نظم عربی اور فارسی الفاظ کا ایک دلچسپ اور حسین مرکب ہے۔ عربی کے ساتھ فارسی کے الفاظ ضرور شامل کے گئے ہیں مگر گرامر عربی ہی کی استعمال کی گئی ہے۔ فارسی الفاظ فارسی تلفظ کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں مگر اسی انداز کے ساتھ جس انداز سے عربی الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مطلع کے دوسرے مصرعے میں لفظ ''چشم'' پر الف لام کا استعمال اور مضاف الیہ ہونے کے بناء پر اس کی حالت جر۔ یا چونکہ اس نظم کا حروف روی ''م'' ہے۔ لہٰذا اس کو مجرور ہونے کی بنا پر عربی شاعری کے قواعد کے مطابق اشباع کرنا''

(صفحہ ۵۷)

ظاہر ہے کہ مذکورہ قصیدہ صرف عالم لکھنوی کی شعری مہارت اور بلندی فکر کا اظہار یہ نہیں ہے بلکہ مذکورہ قصیدہ ان کے عہد کے ادبی رجحانات اور شعری امتیازات کو بھی روشن کرتا ہے۔ اگرچہ وہ عہدہ فارسی شاعری کا زوال آمادہ دور ہے لیکن تہذیبی اور ثقافتی اجزا اپنے پورے رسوخ کے ساتھ، شعری فضا میں تنفس کرتے نظر آتے ہیں۔

کتابیات:

۱۔ قند آب عجم، مولانا الطاف حسین عالم لکھنوی، ترتیب میرزا محمد یوسف، پاریکھ آفسیٹ پریس، لکھنو، ۲۰۰۲ء
۲۔ انتخاب کلیات، مولانا الطاف حسین عالم لکھنوی، باترتیب: میرزا محمد یوسف، نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۰ء
۳۔ اودھ کے فارسی گو شعرا، ڈاکٹر زہرہ فاروقی، فائن آفسیٹ ورکس، اردو بازار، دہلی، ۲۰۰۳ء

❑❑❑

ڈاکٹر بدیع الزماں

اسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، کرم چند بھگت کالج، بیڑو، رانچی

6200868131

ایک نفسیاتی افسانہ نگار: عصمت چغتائی

تانیثیت ایک رجحان ہے جس کی شروعات مغرب سے ہوئی اور جسے اب پوری دنیا اپنا رہی ہے۔ تانیثیت اور نسائیت کو کئی مفکرین ایک ہی مانتے ہیں جب کہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ نسوانیت یا نسائیت کا تعلق عورت کی طبعی خصوصیات، ذاتی صفات سے وابستہ ہیں۔ نسائیت دراصل عورت کا عورت پن ہے، اسکے ایسے داخلی وخارجی صفات ہیں جو اسے ایک مرد سے الگ کرتے ہیں جبکہ تانیثیت سے مراد مردوں کی بالادستی، ان کے ظلم وستم اور اپنی محکومیت کے خلاف احتجاج سے ہے۔ عورت صدیوں سے مرد کے ہاتھوں ظلم وستم کا شکار ہوتی رہی ہے یہ کسی ایک خطے یا علاقے کی بات نہیں بلکہ دنیا کے کم وبیش تقریباً تمام ممالک میں عورتوں کے ساتھ یہی رویہ رکھا گیا۔ چاہے وہ چین ہو، ایران ہو، انگلینڈ ہو، روم، مصر ہو یا اپنا ہندوستان ہر ملک ہر قوم میں عورت کے ساتھ وحشیانہ سلوک ہوتا رہا ہے۔ عرب میں بھی عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا لیکن اسلام آنے کے بعد حالات بدل گئے اسلام نے عورت کی عظمت کا احساس دلایا اس کے حقوق بحال کیے پھر بھی بحیثیت مجموعی عورت مظلوم ہی رہی۔ اسے کمزور وحقیر سمجھ کر اس کے ساتھ غلاموں سا سلوک کیا گیا۔ مرد کو سارے اختیار حاصل تھے جبکہ عورت کسی بھی معاملے میں خودمختار نہ تھی اسکی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی جانوروں سے بدتر اس کی زندگی تھی۔ تانیثی تحریک نے مرد وعورت کے درمیان امتیازات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور عورت کے حق میں آواز اٹھائی۔

جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے اردو افسانے میں تانیثی رجحان کی اولین محرک اور احتجاج اور مزاحمت کی آواز بلند کرنے والی پہلی خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنے افسانوں سے نہ صرف قدامت پرستی اور توہم پرستی پر کڑی ضرب لگائی بلکہ ادبی سطح پر بھی نئے معیار اور نئی قدروں کو جنم دیا۔

خواتین اردو ادب میں سب سے پہلی واضح آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ ان کا لب ولہجہ، ان کا آہنگ، ان کا انداز تحریر خالص تانیثی ہے۔ رشید جہاں کی بے باکی نے اپنے عہد میں تہلکہ مچا دیا تھا مگر عصمت چغتائی اس سے بھی آگے نکل گئیں اور انہوں نے جس بے دردی کے ساتھ اپنے عہد کے ضمیر کو جھنجھوڑا اس کی مثال ان سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتی۔ انہوں نے شمالی ہندستان کے متوسط طبقے کی مسلم گھرانے کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، فرسودہ رسم ورواج، اخلاقی اقدار کی کھل کر مخالفت کی اور اپنی تخلیقات میں عورتوں کے مسائل کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

> ”عصمت چغتائی کا ایک افسانہ ”چابڑے“ بھی ہے جس میں انہوں نے مرد کی جنسی و نفسیاتی کیفیتوں کو بڑے بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے ’چابڑے‘ دراصل چچا بڑے کو کہا گیا ہے جو کہ کافی عیاش قسم کا انسان ہے اور ہر طرح کے غلط کام اس کا پیشہ۔ کہتے ہیں انھیں جوانی میں اپنی چچازاد بہن عمدہ خالہ سے عشق ہو گیا تھا لیکن ان کی شادی کسی اور سے ہو گئی تھی۔ پھر بھی چابڑے انھیں نہیں بھلا پائے اور طوائفوں کے پاس جا کر اپنی جنسی بھوک مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ ”چابڑے کو اصل میں چچا کہنا چاہیے تھا مگر لوگ جلدی میں انھیں چابڑے ہی کہتے تھے۔ ان کا اصل نام تو تمیز الدین یا امتیاز الدین یا ممتاز الدین تھا۔ غرض دین ضرور لگا ہوا تھا حالاں کہ دین دھرم سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نماز بھی کبھی وہ بھولے بھٹکے پڑھ لیتے تھے روزے جوانی میں جوانی کی وجہ سے اور بڑھاپے میں دمے کی وجہ سے نہ رکھ سکے۔“

عصمت چغتائی نے جس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی اس زمانے میں عام طور پر شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں پردے کی پابندیوں کے سبب گھر کی چار دیواروں میں مقید رہتی تھیں۔ افسانے لکھنا یا شاعری کرنا آوارگی کے مترادف سمجھا جاتا تھا لیکن عصمت چغتائی نے اپنے زمانے کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنی بات بڑی بے باکی سے رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنے تانیثی فکر وشعور کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ تانیثیت کی بنیادی تعبیر وتوضیح عورت کی انسانی حیثیت کو پہچاننا اور معاشرے میں موجود اس انسانی حیثیت کی تکمیل میں رخنہ ڈالنے والی طاقتوں کے خلاف عملی اقدام اٹھانا ہے اس طرح تانیثی شعور دراصل انسانی شعور ہے کیوں کہ عورت کے وجود، اس کی تشخص اور اس کی بہتر حیثیت سے منکر ہونا غیر انسانی حرکات ہیں اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ تانیثی شعور کے بغیر انسانی شعور کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ عصمت چغتائی کی زندگی اور تحریر دونوں اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے عورت کی انسانی حیثیت کو پہچانا، معاشرے میں اس کی حیثیت کو مسخ کرنے والی لاتعداد بندشوں اور حصاروں کو توڑنے کی کوششیں کیں اور اپنی بے مثل، بے باک تحریروں کے ذریعے ان دقیانوسی ذہنیت اور معاشرتی رسموں اور رواجوں کو سینچنے والے نظام کے خلاف احتجاج کیا۔

عصمت چغتائی کے افسانے ایک تانیثی ذہن، تانیثی شعور اور تانیثی ادراک کی سمتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ دل پھینک عاشقوں کے تئیں ان کا ردِّعمل بھی دلچسپ ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’بیسویں صدی کے نوجوانوں کی بدمذاقی۔ جی چاہا ان میں سے ایک کو بلا کر کہوں'' بھائی یہ شعر جو تو گنگنا رہا ہے، بہت پرانا ہے، شعلہ طور میں سے کوئی جلتا ہوا شعر پکڑ، اور تیرے بالوں میں جو آنولے کا تیل ہے، آدھ درجن سروں کے لیے کافی ہوتا۔ اور تیری بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے ذرا اونچی کٹی ہے، ابھر ابھر کر تیرے ذوق کی داد دے رہی ہے، تیری کچلیاں بہت نمایاں ہیں۔ پان کی پیک میں لتھڑ کر بڑی بھیانک معلوم ہو رہی ہیں، اور تو اتنی ڈھیلی دھوتی مت پہن، اور کرتا بھی بہت بڑا ہے، جو تو نے اشوک کمار وغیرہ کو بے گریبان کے بڑے بڑے تھیلے پہنے دیکھا ہے، وہ تیرے اس ٹھگنے قد پر اچھے نہیں لگتے۔‘‘

(افسانہ۔ سفر میں از چوٹیں)

عصمت کے مطابق پدرانہ معاشرے میں عورت کی جو حیثیت ہے وہ انتہائی پست اور قابلِ رحم ہے اور مرد نے اپنی برتری اور افضلیت کا ایک ایسا جال بنا ہے جس میں اس نے عورت کو قید کر رکھا ہے۔ اپنے مشہور افسانے ''لحاف'' میں انہوں نے ایک عورت کی نفسیات، اسکی فطری کمزوریوں، اسکے جنسی مسائل کو بے حد موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانہ لحاف میں عصمت چغتائی نے ایک ایسے المیے کو پیش کیا ہے جو بے جوڑ شادی کا نتیجہ ہے۔ پختہ عمر کے نواب صاحب اپنی حسین بیوی کے بجائے نوجوان لڑکوں کے ساتھ زیادہ خوش رہتے تھے۔

بیگم جان سے شادی کر کے وہ انھیں گھر کے دوسرے ساز و سامان کے ساتھ رکھ کر بھول گئے تھے۔ وہ بیچاری دبلی پتلی سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں۔ بیگم منتیں، مرادیں مانگتی۔ چلّے ٹوٹکے کرتی مگر نواب صاحب اس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں ہوئے۔ اس طرح انتقاماً مجبور ہو کر بیگم جان نے بھی اپنی جنسی تسکین کے لیے ایک غیر فطری طریقہ اختیار کر لیا اور وہ اپنی ملازمہ ربو کے ساتھ زندگی کے دن پورے کرنے لگی۔

اس افسانے میں عصمت چغتائی نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ایک نوجوان شریف عورت جب ظالم مرد کے شکنجے میں پھنس جاتی ہے تو وہ طرح طرح کے ظلم برداشت کرنے پر مجبور کی جاتی ہیں اور پھر عورت کی بھی مجبوریاں اس کو مختلف راستوں پر لے جاتی ہیں۔ جن عورتوں کو مرد بے جان سمجھ کر گھر کی چہار دیواری میں مقید کر دیتے ہیں وہ بھی زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ تلاش کر لیتی ہیں۔ بیگم جان بھی ایک ایسے ہی ماحول سے دوچار ہوئیں۔

عصمت نے اس افسانے میں عورت کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی ہے جو جنسی مسائل ذہنی الجھن کا سبب بنتے ہیں خاص کر ایسا معاشرہ جہاں عورت اور مرد کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہو جائے۔ کہنے کو تو سب کہہ سکتے ہیں کہ ضبط و قابو بڑی چیز ہے۔ مگر یہ ضبط و قابو صرف عورتوں کے لیے کیوں، مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت بھی کراہنے کا حق رکھتی ہے۔ ادب کی دنیا میں یہ پہلا دھماکہ تھا اور پہلی بار عورت نے بے باکانہ طور پر اپنی جنسی اور جذباتی زندگی کے احساسات کی کیفیت کا اظہار کیا تو ادب کے نقادوں نے ان پر فحش نگاری کا الزام لگایا۔

عصمت چغتائی کا ایک افسانہ ’چابڑے‘ بھی ہے جس میں انہوں نے مرد کی جنسی و نفسیاتی کیفیتوں کو بڑے بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے ’چابڑے‘ دراصل چچا بڑے کو کہا گیا ہے جو کہ کافی عیاش قسم کا انسان ہے اور ہر طرح کے غلط کام اس کا پیشہ۔ کہتے ہیں انھیں جوانی میں اپنی چچا زاد بہن عمدہ خالہ سے عشق ہو گیا تھا لیکن ان کی شادی کسی اور سے ہو گئی تھی۔ پھر بھی چابڑے انھیں نہیں بھلا پائے اور طوائفوں کے پاس جا کر اپنی جنسی بھوک مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔'' چابڑے کو اصل میں چچا کہنا چاہیے تھا مگر لوگ جلدی میں انھیں چابڑے ہی کہتے تھے۔ ان کا اصل نام تو تمیز الدین یا امتیاز الدین یا ممتاز الدین تھا۔ غرض دین ضرور لگا ہوا تھا حالاں کہ دین دھرم سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نماز بھی کبھی وہ بھولے بھٹکے پڑھ لیتے تھے روزے جوانی میں جوانی کی وجہ سے اور بڑھاپے میں دمے کی وجہ سے نہ رکھ سکے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور سینکڑوں لتوں کے ساتھ عورتوں کی لت بھی لگی ہوئی تھی۔‘‘

ان کا افسانہ ’’جھوٹی تھالی‘‘ بھی تانیثی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں عصمت نے ایک لڑکی کے جذبات اور معاشرے کی گھناؤنی سوچ کو منظر عام تک پہنچایا ہے۔ اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ مسز اگروال کی بیٹی بکی نئی نسل کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے وہ ایک انٹرویو کے لیے یونیورسٹی جا رہی تھی واپسی میں ایک زخمی بچے کو ہسپتال پہنچانے کی بھاگ دوڑ میں اسکے بال بکھر گئے، کرتا پھٹ گیا اور کپڑوں پر جابجا خون کے دھبے لگ گئے تھے وہ گھبرائی پریشان گھر واپس آئی ان حالات میں بکی کے ماں باپ کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ بکی کا ریپ ہو گیا اور یہ بات ان کے سمدھیانے (جو کہ پڑوس میں ہی تھا) میں بھی پہنچ گئی۔ بکی کے ماں باپ پیسے اور جائداد دے کر معاملے کو سلجھانے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ بکی بڑے ڈرامائی انداز میں سفید کپڑے پہن کر آئی اور سب کو نمسکار کرنے کے بعد بولی:۔

’’میں آپ سب کی آبھاری ہوں کہ آپ نے مجھ ابلا کو سویکار کیا اور تمہاری بھی میرے دیوتا میرے ہونے والے پران ناتھ کہ تم نے جھوٹی تھالی کو سویکار کیا دھن ہو تم سوامی؟ میں ابھاگن اپوتر ہو چکی ہوں میں جھوٹی ہو چکی ہوں میرا سروناش ہو چکا ہے سب کچھ لٹ چکا ہے میرا کنوارہ پن بھنگ ہو چکا ہے مگر تم کنوارے ہو جس پر زبردستی ہو وہ گندی ہو گئی اور جو ہر اٹھل میں مزے اڑائے جاتے ہیں وہ پوتر تم سونے کا پیالہ ہو میلہ ڈال دو تو بھی پوتر میں مٹی کا ٹھکرا ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور‘‘۔

پھر بکی نے بتایا کہ اس کا ریپ نہیں ہوا تھا بلکہ زخمی بچے کے خون سے کپڑے خراب ہو گئے تھے اس لئے اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ ہاسٹل میں رہے گی اور گھر چھوڑ دے گی۔ اس کہانی میں بکی کے روپ میں نئی پود کا شعوری عزم ملتا ہے وہ شادی کا غلط تصور اور عورتوں پر مردوں کی اجارے داری تسلیم نہیں کرتی اس لیے وہ نہ صرف اپنے منگیتر سے رشتہ توڑ لیتی ہے بلکہ والدین کے گھر میں رہنے سے بھی انکار کر دیتی ہے۔

ان کے علاوہ بھی عصمت چغتائی کے دیگر افسانوں میں تانیثی رنگ نظر آتا ہے۔ ’’چوتھی کا جوڑا‘‘، ’’ننھی کی نانی‘‘ جیسے کئی افسانے اسی قبیل کے ہیں۔ مرد اساس معاشرہ اور مرد حاوی سوچ کے خلاف ان کا مزاحمتی رویہ قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے لئے جو راستہ بنایا اردو ادب کی تقریباً تمام خواتین نے اسی راستے سے گزر کر اپنی نئی راہ نکالی۔ سالوں گزر جانے کے بعد بھی عصمت کی جگہ کوئی نہیں لے سکا۔ خواتین کے حق کے لئے لڑنے والی، اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے والی ایک بے باک اور نڈر افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی جگہ آج بھی محفوظ ہے۔

□□□

ڈاکٹر سید ذوالقرنین
کرشچین کالج، وزیر گنج لکھنؤ
8299841804

طوطی ہند امیر خسرو

امیر خسرو کا نام عبدالحق یا مین الدین خسرو تھا اور والد سیف الدین وہ ایک عظیم جنگجو تھے اُنکی والدہ ثروت منداور وزیر اعظم کی بیٹی تھیں امیر خسرو کے دو بھائی تھے بڑے کا نام عزیز الدین اور چھوٹے بھائی کا حسام الدین تھا 1253 ماہ مارچ قصبہ مومن پورہ جو کہ اب پٹیالی کے نام سے جانا جاتا ہے اور دہلی کے پاس ہے جب امیر خسرو کی ولادت ہوئی تھی اُس وقت ہندوستان پر شہنشاہ نصیر الدین کی حکومت تھی اُس دور حکومت کے بعد امیر خسرو کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور اُنکی خصوصیات اور کمالات نصیر الدین کی حکومت کے اختتام کے بعد اُجا گر ہوئیں۔

غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں ترقی کے مراحل طے کرنا شروع کیا اور پھر اسی دور میں اُنکی خصوصیات منظر عام پر آئیں غیاث الدین بلبن ایک اچھا منتظم کار اور ملک کی تعمیر و ترقی اور سرحدوں کو مضبوط کرنے میں مستقل لگا رہتا تھا، جبکہ وہ معمولی پڑھا لکھا تھا لیکن شعر و شاعری کا شوق و ذوق رکھتا تھا، اور شعرا کو تحائف سے نوازتا بھی تھا اور اس سے قبل نصیر الدین اور سلطان شمس الدین اور اُسکی بیٹی رضیہ سلطانہ یہ لوگ قطب الدین ایبک کی کمان میں ہندوستان آئے تھے یہاں کی وسیع تر زراعت، خُوب صورت باغات، حیران کن پھل پھول، صحت افزا آب و ہوا، اور سادہ مزاج افراد اُن سب وجہوں سے اُنہیں ہندوستان میں رہنے سے مجبور کر دیا تھا، اور وہ واپسی کے لئے تیار نہ ہوئے اسی دوران ایک جنگ کی شروعات ہوئی اور اُس جنگ کی منگول بغاوت تھی جسکی قیادت چنگیز خان اور اسکالر کا ہلاکو خان انجام دے رہا تھا۔

تمام اسلامی سلطنت کو انہوں نے کچل کر رکھ دیا تھا اور اس میں بغداد و بلخ بھی شامل تھے جو کے اُس دور کے عظیم اور قدیم ثقافتی مراکز تھے، حافظ اور سعدی نے اپنی شاعری میں ثقافت اور انسانیت کی بربادی پر بہت آنسو بہائے تھے، اس وقت ہر انسان راہ فرار اختیار کر رہا تھا اسی درمیان امیر خسرو کے والد سیف الدین بھی ہندوستان پہونچے اور دہلی میں قیام پذیر رہے اور سلطان شمس الدین التمش کی فوج میں شامل ہو گئے اور چند دنوں میں التمش کی فوج کے کمانڈر بن گئے اور پٹیالہ کی تمام ریاست اُنہیں عطا کی گئی، شمس الدین التمش کے کافی قریب ہو گئے تھے اور وہ اُنکی بہت تعریف کرتا تھا اور اُنکی بڑی عزت کرتا تھا اور اچھی تنخواہ دی جاتی تھی دربار میں ایک الگ مرتبہ تھا جب امیر خسرو اُن سے پیدا ہوئے تھے تب اُنکے باپ یا دادا غالباً حضرت نظام الدین اولیاء کے پاس لے گئے انہوں نے بچے کو دیکھا اور فرمایا آپ ایک ایسے بچے کو میرے پاس لائے ہیں جو یقیناً خاقانی سے چند فٹ بلند ہوگا اُنکے والد کو سرحد پر مغلوں کے ساتھ ایک مقابلے میں مارا گیا اُس وقت خسرو صرف سات برس کے تھے اس صدمہ کو انہوں نے اپنی شاعری میں بھی ظاہر کیا ہے ایک تلوار میرے سر کے پار ہوگئی اور میرے دل کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر گئی بالخصوص اُس وقت جبکہ میری دریا کی روانی کا آغاز ہی ہوا تھا اور موتی کو تنہا چھوڑ گئی۔ خسرو جب دہلی پہونچے تو وہاں کی خوب صورتی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے اور دہلی کی تعریف میں۔ بہت کچھ تحریر بھی کیا تھا۔

امیر خسرو نے پنجابی زبان بھی سیکھی تھی اور انہوں نے اس زبان میں۔ بہت سے دوہرے بھی کہے یعنی اردو کی جدید رباعی یقیناً خسرو نے اپنی فطرت کے مطابق ہر اُس چیز کے بارے میں لکھا ہوگا جو اُنکی نظروں میں آئی تھی اُنکی یہ تحریریں محلاتی سازشوں اور تخت دہلی کی سازشوں یا شاہی خاندانوں کی رونقوں سے ہٹ کر تھیں اور حوادث زمانہ نے اُنکی ان تحریروں کو ناپید کر دیا خسرو نے اپنی شاعری میں دل و دماغ اور روح کے خیالات سمو دیئے تھے جیسے خسرو کا واضح انداز میں شاہنشاہ سے اِس طرح دریافت کرنا، آپ ایک۔ بہت بڑی سلطنت کے شہنشاہ ہیں اور اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ کے کندھوں پر عظیم ذمے داریوں کا بوجھ ہے آپ امیروں کو امیر تر بنا رہے ہیں اور حقیقی بھوکوں کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔

> ”غریبوں کے پاس سواری کے لیے گدھا تک نہیں ہے کیا آپ جانتے ہیں کہ غریبوں کے پاس سر چھپانے کے لیے جگہ تک نہیں ہے اور وہ زیر آسمان زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جبکہ آپ کے قریبی عزیز اور رشتے دار آپ کے خاص افراد زندگی کی نعمتوں سے اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور پارٹیوں پر بے دریغ رقوم خرچ کر رہے ہیں،، یہ محض امیر خسرو کی آواز نہ تھی بلکہ انسانیت کی آواز تھی جو مساوات اور انصاف کے لئے دُہائی دے رہی تھی وہ لوگوں کی آواز تھی رعایا کی آواز تھی اور لوگوں کی آواز خدا کی آواز ہے۔ جو امیر خسرو کے ذریعہ شہنشاہ کے ایوانوں میں گونجی تھی کچھ سوانح نگاروں نے اس امر کا بھی تذکرہ کیا تھا کہ خسرو نے اپنی مقبولیت کے دوران بالخصوص اُس دور میں جبکہ سعدی اور حافظ جیسے دو نامور دانشوروں نے اُسے اعزاز سے نوازا تھا“۔

اعلیٰ عہدوں اور طاقت وروں کو دیہاتوں، جاگیروں، اور ہزاروں ایکڑ آراضی سے نوازا جارہا ہے لیکن غریب کسانوں اور مزدوروں کیلئے آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، فاتح کمانڈروں کو سینکڑوں گھوڑے اور ہاتھی انعام کے طور پر پیش کیے جارہے ہیں۔

غریبوں کے پاس سواری کے لیے گدھا تک نہیں ہے کیا آپ جانتے ہیں کہ غریبوں کے پاس سر چھپانے کے لیے جگہ تک نہیں ہے اور وہ زیر آسمان زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جبکہ آپ کے قریبی عزیز اور رشتے دار آپ کے خاص افراد زندگی کی نعمتوں سے اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور پارٹیوں پر بے دریغ رقوم خرچ کر رہے ہیں،،یہ محض امیر خسرو کی آواز نہ تھی بلکہ انسانیت کی آواز تھی جو مساوات اور انصاف کیلیے دُہائی دے رہی تھی وہ لوگوں کی آواز تھی رعایا کی آواز تھی اور لوگوں کی آواز خدا کی آواز ہے جو امیر خسرو کے ذریعہ شہنشاہ کے ایوانوں میں گونجی تھی کچھ سوانح نگاروں نے اس امر کا بھی تذکرہ کیا تھا کہ خسرو نے اپنی مقبولیت کے دوران بالخصوص اُس دور میں جبکہ سعدی اور حافظ جیسے دو نامور دانشوروں نے اُسے اعزاز سے نوازا تھا اُس وقت خسرو نے اُنہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی انہوں نے انکا شکریہ ادا کیا تھا کہ اُنہوں نے انکو طوطی ہند،، کے خوبصورت اور مٹھاس بھرے خطاب سے نوازا تھا جس کا مطلب تھا ہندوستان کا طوطا،، حافظ نے صحت کی خرابی کی وجہ سے اُس دعوت کو قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ لیکن سعدی ہندوستان آئے تھے یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ دعوت ایک غزل کی شکل میں پیش کی گئی تھی جو ایک سفید ریشمی رومال پر لکھی گئی تھی جسے سعدی بیحد پسند کرتے تھے اور انہوں نے صحت کی خرابی کے باوجود ہندوستان کا سفر کیا تھا، امیر خسرو کو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا مثنوی ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ہست مرا مولد و ماد یو وطن ہندوستان کے عاشق صادق اور سچے وطن پرست تھے اپنی شاعری میں جہاں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں اُنکی رُوح وجد میں آجاتی ہے اور منھ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں مثنوی سپہر،، کا سب سے اہم اور بڑا باب ہندوستان کی تعریف میں ہے اس میں چار پانچ سو شعر ہیں جس میں ہندوستان کے باشندوں کی ذہانت اُنکے مذہبی عقائد، زبانوں، رسم و رواج، پرندوں، موسموں، پھلوں، غرض کہ ہر چیز کہ بارے میں جس شدتِ احساس سے خسرو نے شعر کہے ہیں اُسکی مثال شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں مل سکے ایک جگہ اُنہوں نے اپنی پدری زبان ترکی اور فارسی پر ہندوی کو ترجیح دی ہے۔

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

□□□

گزارش

براۓ کرم اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات، بینک اکاؤنٹ نمبر، بینک کا نام و برانچ کا نام، آئی ایف ایس سی کوڈ نمبر ضرور تحریر کریں۔

اس کے بغیر کسی بھی تخلیق کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

Name:-
Account No:-
Bank and Branch Name:-
IFSC No:-

ایڈیٹر نیا دور

غزل

صبح کا منظر شام کے جیسا لگتا ہے
پیار مرا الزام کے جیسا لگتا ہے

محنت کا یہ اجر بھی مجھ کو کیوں آخر
بالکل میرے دام کے جیسا لگتا ہے

دنیا میخانہ ہے اور میرا ہونا
خالی خالی جام کے جیسا لگتا ہے

غالب تجھ کو سننے والی روحوں کو
شعر ترا الہام کے جیسا لگتا ہے

ایک ندی اور دو ساحل کا ذکر مجھے
تیرے میرے نام کے جیسا لگتا ہے

گلیوں گلیوں امن کا نعرہ ہم وطنوں
کیوں مجھ کو کہرام کے جیسا لگتا ہے

ایسی ویسی محفل میں مصداق مجھے
چپ رہنا بھی کام کے جیسا لگتا ہے

مصداق اعظمی
موضع۔ جوماں پوسٹ۔ مجواں، پھولپور ضلع۔ اعظم گڑھ
9451431700

عمر فاروق

دلدار کرناہ کپواڑہ، کشمیر

9149506616

ممتاز ترین ڈرامہ نگار- آغا حشر کاشمیری

آغا حشر کاشمیری جنہیں ادبی دُنیا میں ''شیکسپیئر ہند'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار تھے۔ اُردو ڈرامہ کی مختصر تاریخ میں آغا حشر کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری نے اسٹیج پر جب قدم رکھا تو پہلے وہ ایک اداکار کی حیثیت سے بعد میں کچھ دنوں تک کمپنی کے مالک کی حیثیت سے، اور انتقال سے چند سال پہلے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے آغا حشر کاشمیری نے غیر معمولی اہمیت اختیار کی۔

اُردو ڈرامہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو حشر کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ حشر نے صرف عوام کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ اور نقادوں نے جب ان کی جانب نگاہ اٹھائی تو انہیں ان ڈراموں میں صرف تفریح کے پہلو نہیں دکھائی دیے بلکہ کہیں کہیں ایسا نیا پن بھی نظر آیا جس سے قدیم ڈرامے خالی تھے۔

آغا حشر کاشمیری نے جس وقت ڈرامہ نگاری کی دُنیا میں آنکھیں کھولی تھیں اس زمانے میں نائک پرشاد، طالب بنارسی، میر مہدی حسن احسن لکھنوی، پنڈت نرائن پرساد بیتاب بنارسی، عباس عبداللطیف شاد کا طوطی بول رہا تھا۔ مگر آغا حشر کاشمیری اپنی تیز رفتاری، چابک دستی، ثابت قدمی اور حشر نگاری کا سہارا لے کر کچھ ہی مدت کے دوران ان تمام معاصرین سے کوسوں دُور آگے نکل گئے۔ یہ بات بالکل اپنی جگہ اٹل ہے کہ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کی فنی خوبی اور بصیرت، ادبی عظمت، امتیازی خصوصیت اور قدر و منزلت کا اندازہ صرف اس وقت صحیح طور پر لگایا جا سکتا ہے جب ان کا ڈرامہ نگاری پر بحث کرنے اور پرکھنے سے پہلے ان کے عہد کی ڈرامہ نگاری اور ان کے ہم عصروں کے فن کا مطالعہ کیا جائے۔

اُردو ڈرامہ کا شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کا اصل نام آغا محمد شاہ تھا۔ ان کے والد غنی شاہ کشمیر سے بنارس آئے تھے اور وہیں آباد ہو گئے تھے۔ بنارس ہی کے محلہ گوبند کلاں، ناریل بازار میں 1879 میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ڈرامہ اور شاعری سے دلچسپی تھی۔ 17 سال کی عمر سے شاعری شروع کر دی اور 18 سال کی عمر میں آفتابِ محبت کے نام سے ڈرامہ لکھا، جسے اس وقت کے مشہور ڈرامہ نگاروں میں مہدی احسن لکھنوی کو دکھایا تو انہوں نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ ڈرامہ نگاری بچوں کا کھیل نہیں۔ احسن لکھنوی کی اس بات کو آغا حشر کاشمیری نے بطورِ چیلنج قبول کیا اور اپنی تخلیقی قوت اور ریاضت سے اس طنز کا ایسا مثبت جواب دیا کہ آغا حشر کے بغیر اُردو ڈرامہ کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ انہیں جو شہرت، مقبولیت، عزت اور عظمت حاصل ہے وہ ان کے بہت سے پیش روؤں اور معاصرین کو نصیب نہیں ہے۔

مختلف تھیٹر کمپنیوں سے آغا حشر کاشمیری کی وابستگی رہی اور ہر کمپنی نے ان کی صلاحیت اور لیاقت کا لوہا مانا۔ الفریڈ تھیٹر کمپنی کے لئے آغا حشر کو ڈرامے لکھنے کا موقع ملا۔ اس کمپنی کے لئے آغا حشر نے جو ڈرامے لکھے وہ بہت مقبول ہوئے۔ ہر چند کہ آغا حشر 1897 میں اپنا پہلا ڈرامہ ''آفتابِ محبت'' ضبطِ تحریر میں لائے، لیکن اسے اسٹیج کرنا انہیں نصیب نہیں ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ کے کچھ ناقدین ''مرید شک'' (1899) کو ان کا پہلا ڈرامہ گردانتے ہیں جسے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی ممبئی نے اسٹیج پر پیش کیا۔ اگر اسی ڈرامے کو آغا حشر کاشمیری کی ڈرامہ نگاری کا نقطۂ آغاز مان لیا جائے تو ڈرامہ اور اسٹیج سے آغا حشر کی وابستگی تقریباً 33 سال پر محیط ہو گی۔ اس دوران ان کے لکھے اور اسٹیج کئے گئے ڈراموں کا فنی جائزہ لینا اور ان کے امتیازی نشانات کو تاریخی اعتبار سے بالترتیب پیش کرنا دشوار کن ہو گا۔ کیونکہ ان کے کئی ڈرامے معمولی ترمیم اور اضافے کے بعد مختلف عنوانات کے تحت اسٹیج کی زینت بنے، پھر بھی محققین کی اکثریت ان کی ڈرامہ نگاری کو تین ادوار میں منقسم کرنے پر متفق نظر آتی ہے۔ ان ہی اہل الرائے کے مطابق آغا حشر کاشمیری کا پہلا دور ترجموں کا دور ہے۔

''آغا حشر کاشمیری نے اپنی ساری زندگی ڈرامے کے لئے وقف کر دی۔ اس کے ذریعہ انہوں نے روپیہ بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی۔ یہی نہیں انہوں نے ڈرامے کے فن کو بھی بلند کیا۔ خود بھی فن کی منزلیں طے کیں اور فن کو بھی ترقی دی۔ اس میں اپنی بلند آہنگ شخصیت اور بے پناہ قدرت سے وسعتیں پیدا کیں۔ جذبات کے ہیجان میں طوفان کا زور اور موجوں کا نور دکھایا۔ تیز شہنائی اور تند نقادوں سے کان بہرے بھی کئے اور ہلکی اور لطیف کیفیتوں سے روح میں اہتزاد بھی پیدا کیا۔ انہوں نے اپنا واسطہ براہِ راست عوام سے رکھا اور عوام کے راستے سے وہ خواص کے دلوں تک پہنچے۔ ڈاکٹر جانسن کے اس مقولے پر انہوں نے ساری عمر عمل کیا۔ قبولِ عام کسی کی مقبولیت کی آخری سند ہے۔''

اس دور میں انہوں نے کئی انگریزی ڈرامے بالخصوص شیکسپیئر کے ڈراموں کو اپنی ذہانت اور فطانت کے بل پر اُردو زبان کا جامہ تو ضرور پہنایا لیکن اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے سے اجتناب بھی برتا۔ ناقدینِ فن نے یہ کہہ کر اپنا اعتراض درج کرایا کہ:

"ایسا کرنے سے اصل ڈرامے کی روح مجروح ہوگئی، اس کے مفہوم بدل گئے، حتیٰ کہ کئی جگہ ٹریجڈی، کامیڈی اور کامیڈی، ٹریجڈی بن کر رہ گئی۔ یہ معترضین شہید ناز، سفید فون، صید ہوس، یہودی کی لڑکی اور سلور کنگ جیسے ڈراموں کو آغا حشر کاشمیری کے پہلے دور سے تعبیر کرتے ہیں اور نشانہ بناتے ہیں"۔

دوسرے دور میں آغا حشر کاشمیری کے قدیم طرز کے ڈرامے آتے ہیں جو انہوں نے پیش روؤں کے طرزِ نگارش میں لکھے، ان میں خوبصورت بلا، نعرۂ توحید، تصویرِ وفا وغیرہ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ جن میں پرانے انداز کے ڈراموں کی وہی رومانیت اور مثالیت، ہنگامہ خیزی اور سطحیت، بے جا عبارت آرائی اور شاعری موجود ہے۔ اس دور کے ڈراموں میں آغا حشر نے نثری مکالموں پر خصوصی توجہ دی اور گانوں کی تعداد میں بھی خاص کمی کی۔

حشر کا تیسرا یعنی آخری دور آغا حشر کی حشر سامانیوں کا دور تھا۔ اس دور میں انہوں نے اپنے قلم کی جولانیوں سے بعض اہم ڈرامے لکھے۔ ترکی حور، بلوا منگل، آنکھ کا نشہ، رستم سہراب، عشق وفرض اس دور کے قابلِ ذکر ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں سماجی مسائل، قومی زندگی، حب الوطنی، تحریک آزادی نے جگہ پائی۔ ان ڈراموں میں ان کا فن، سلیقہ اور تجارتی نقطہ نظر عروج پر ہے۔ حشر نے جس وقت یہ ڈرامے لکھے اس وقت تک بڑے بڑے ہال، مائکروفون وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ عموماً یہ ڈرامے منڈیوں یا پنڈال میں ہوا کرتے تھے۔ ہزاروں کا مجمع ہوتا، اس لئے کرداروں و مکالمے بلند آواز سے بولنے پڑتے۔ اس لئے ویسے مکالمے لکھے جاتے جس میں بلند آہنگی اور گھن گرج ہو۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

"کمرشیل اسٹیج کی سب سے بڑی دریافت آغا حشر کاشمیری تھے۔ جن کے ڈرامے مدت تک ہلچل مچاتے رہے۔ حشر کا آرٹ ادبی اعتبار سے احسن بیتابؔ اور دہلی گیٹ کے ڈراموں کا تکملہ تھا۔ آغا حشر نے اردو اسٹیج کے ڈراموں کو ادبیت دی، وہ گھن گرج بخشی جس نے تھیٹریکل تکنیک کا آغاز کر دیا جو حشرِ اسٹائیل کہلاتا ہے"۔ (منتخب ڈرامے۔ ص 14)

حشر کے اس تجارتی انداز سے ہزار اختلاف کیا جائے، لیکن اس انداز سے اُردو ڈرامے کو وہ عوامی مقبولیت عطا کی کہ جس شہر میں آغا حشر کی منڈلی پہنچ جاتی ایک دھوم مچ جاتی۔ حشر کے مکالمے خاص طور سے مطالعہ کے مستحق ہیں، کیونکہ ان میں تنوع پایا جاتا ہے، کبھی کبھی وہ بالکل مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں اور کردار نثر میں بات کرتے کرتے شاعری کرنے لگتے ہیں۔

آغا حشر کو اُردو کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے لیکن کوئی تعلق اور مناسبت نہیں ہے۔ ایک تخلیق کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے اور حیاتِ انسانی کا حیرت خیز مصور، مبصر اور عالم ہے تو دوسرا ڈرامہ نگاری کے بندھے ٹکے اصولوں پر چل کر عوام کی پسند اور تجارتی ماحول کا شکار ہو کر صرف فن کی سرحدوں کو چھو کر رہ جاتا ہے۔ حشر کے تخیل میں بلند پردازی نہ تھی لیکن وہ ایسی ڈرامائی کیفیت ضرور پیدا کرتے تھے جس سے ان کی طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے ڈراما نگاری میں کوئی بڑا انقلاب پیدا نہیں کیا مگر ادبی اور تفریحی دونوں حیثیتوں سے انہوں نے اسے کچھ اوپر ضرور اٹھایا۔ بے مقصد قصہ گوئی سے ہٹ کر انہوں نے سماجی مسائل کو اپنے ڈراموں میں جگہ دی اور قدیم حدول کے اندر نیا رنگ و روغن استعمال کر کے اسٹیج کو چمکا دیا۔ اگر وہ سستی شہرت سے بچ کر ڈراما لکھتے اور زندگی کو انفرادی اور سماجی کشمکش کی بنیادوں پر اپنی ڈراما نگاری کی عمارت کھڑی کرتے تو حشر کا نقش تاریخ ادب پر گہرا اُبھرتا۔ احتشام حسین اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"اگر تجارتی انداز اور اغراض سے الگ ہو کر وہ آزادی سے ڈرامہ لکھتے تو یقیناً اس سے بہتر لکھ سکتے تھے"۔

آغا حشر کاشمیری نے اُردو و ہندی اور بنگلہ زبان میں ڈرامے لکھے جس میں کچھ طبع زاد ہیں اور کچھ وہی ہیں جن کے پلاٹ مغربی ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

"آغا حشر کاشمیری نے اپنی ساری زندگی ڈرامے کے لئے وقف کر دی۔ اس کے ذریعہ انہوں نے روپیہ بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی۔ یہی نہیں انہوں نے ڈرامے کے فن کو بھی بلند کیا۔ خود بھی فن کی منزلیں طے کیں اور فن کو بھی ترقی دی۔ اس میں اپنی بلند آہنگ شخصیت اور بے پناہ قدرت سے وسعتیں پیدا کیں۔ جذبات کے ہیجان میں طوفان کا زور اور موجوں کا نور دکھایا۔ تیز شہنائی اور تند نقادوں سے کان بہرے بھی کئے اور ہلکی اور لطیف کیفیتوں سے روح میں اہتزاز بھی پیدا کیا۔ انہوں نے اپنا واسطہ براہِ راست عوام سے رکھا اور عوام کے راستے سے وہ خواص کے دلوں تک پہنچے۔ ڈاکٹر جانسن کے اس مقولے پر انہوں نے ساری عمر عمل کیا۔ قبولِ عام کسی کی مقبولیت کی آخری سند ہے"۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حشر میں ڈراما نگاری کی وہ صلاحیتیں موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ قدیم اور جدید ڈراما نگاری کے درمیان میں ایک اہم کڑی بن گئے اور انہیں اُردو ڈراما نگاری کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی

(۱) اُردو میں ڈرامہ نگاری۔ سید بادشاہ حسین

(۲) تنقیدی اشارے (تیسرا ایڈیشن۔ ہندوستانی ادب میں آغا حشر کا درجہ) پروفیسر آل احمد سرور

(۳) اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط

(۴) آغا حشر اور ان کے ڈرامے۔ پروفیسر وقار عظیم

❑❑❑

التماس

"ماہنامہ نیا دور" کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

تبسم خاں

ریسرچ اسکالر،شعبۂ تاریخ،اودھ یونیورسٹی،ایودھیا

6388899582

تقسیم ہند کا المیہ،خواتین اور فکشن

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم اصل میں سیاسی سرحدوں کی تبدیلی اور جائیدادوں کی تقسیم تھی ،جس کے ساتھ ہندوستانی برصغیر میں برٹش راج کا تحلیل ہونا اور جنوبی ایشیا میں دو حکومتیں وجود میں آئیں ۔بھارت اور پاکستان ۔

یہ بھی سچ ہے کہ تقسیم ہند کی اذیت سے سب سے زیادہ خواتین ہی متاثر ہوئیں ۔ایک اندازے کے مطابق تقسیم ہند کے دوران تقریباً ۷۵ ہزار سے ایک لاکھ خواتین کا درد والم خواتین کے حصے میں آیا۔اُروشی بٹالیا نے اپنی کتاب: ''دُو ادر سائیڈ آف سائیلنس'' میں دعویٰ کیا ہے کہ دونوں طرف سے ۷۵ ہزار خواتین کا اغوا کیا گیا تھا۔اسی طرح کے اعداد وشمار کملا بھسین اور ریتو میمنن نے اپنی کتاب ''بورڈس اینڈ باؤنڈریز : ویمن ان انڈیاز پارٹیشن'' میں خلاصہ کیا ہے کہ پاکستان جاتے وقت جن خواتین کا اغوا کیا گیا تھا انکی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی جب کہ تینتیس ہزار خواتین کا اغوا پہلے ہی بارڈر پر ہو چکا تھا باڈر پر برامدان خواتین کو توہین اور اسٹروک کا سامنا کرنا پڑا ۔ان عورتوں کے بچوں کو درست نہیں مانا گیا۔ان خواتین کے بچوں کو ان سے علیحدہ کر دیا گیا۔حاملہ عورتوں کو یا تو اپنے بچوں کو گود دینا پڑا یا اسقاط حمل کرانا پڑا تھا۔تقسیم کے وقت خواتین کو شکار کیوں بنایا گیا اس کے جواب میں پدرانہ سکٹ کی ذہنیت ظاہر کرتی ہے جس میں خواتین کو عزت واحترام کی چیز مانا جاتا ہے ۔

تقسیم کا المیہ اور عورت : تشدد کا صنفی فرق :

تقسیم کے المیہ کا سب سے زیادہ اثر خواتین پر پڑا ۔تاریخ کے کسی بھی واقعہ کا اثر صنفی وجوہات سے عورتوں اور مردوں پر الگ الگ پڑتا ہے ۔مردوں اور عورتوں پر کئے جانے والے تشدد میں فرق ہوتا ہے ۔مردوں پر جہاں مار پیٹ ،تشدد ،قتل اور اعزہ کو ضرر پہونچانا وغیرہ ہوتا ہے وہیں عورتوں کے ساتھ اغوا،غلامی ،اجتماعی زناکاری ،حاملہ عورتوں کا اسقاط حمل ،شوہر اور بچوں کا قتل کر کے انھیں بے سہارا کر دینا وغیرہ کے ذریعہ مظالم ڈھائے جاتے ہیں ۔ذات برادریوں ،فرقہ واریت ،قبیلائی دنگے فسادات میں خواتین اس طرح کے تشدد کا شکار ہوتی رہتی ہیں ۔

تقسیم ہند دنیا کا ایک بڑا المیہ تصور کیا جاتا ہے ۔خواتین پر ہونے والے سفاکانہ ظلم وتشدد جبراً زناکاری اس واقعہ کو بڑا المیہ بنادیتے ہیں ۔تقسیم ہند کے وقت خواتین پر ہوئے وسیع وحشیانہ تشدد آج بھی بحث اور فکر کے موضوع بنے ہیں ۔

تقسیم کے دوران آنرکلنگ کے مناظر بھی دکھائی دیئے تھے ۔سلل مشرا نے اپنے مضمون The Tragedy of partition میں لکھا ہے کہ ''پدرانہ ذہن نے اپنے گھر کی مستورات کو کسی اور کے ذریعہ بے عزت ہو جانے سے بچانے کے لئے خود ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔انہیں اپنے گھر کی عورتوں کو مار دینا ایک باعزت آپشن لگا ہوگا۔

اُروشی بٹالیا نے زبانی تاریخ طرز پر مکمل اپنی کتاب

"The other Side of Silence : Voices from the partition of India"

میں اپنے گھر کی خواتین کو اپنے ہی گھر کے افراد کے ذریعہ مار دیئے جانے کا تفصیل سے تجزیہ کیا ہے ۔

تقسیم ہند میں آبادی کے نقل مکانی اور بڑی تعداد میں اغوا کی گئی خواتین کی شادی ان کے اغوا کرنے والے مردوں کے ساتھ کرا دی گئی ۔وقت گزرنے کے کچھ دنوں بعد دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنی اپنی عورتوں کی ادلا بدلی کرتے ہوئے واپس لیئے جانے کا فیصلہ کیا۔اس کارروائی کا اثر ان عورتوں کی ذہنیت پر زبردست پڑا ۔اس طرح کی کارروای کو سلل مشرا نے موازنہ دو ملکوں کے قیدیوں کی ادلا بدلی سے کی ہے ۔ان عورتوں کی دو ، دو بار اپنی جگہوں سے ہجرت ہوئی ۔ پہلے اپنے آبائی گھروں سے اور پھر اس

''ہندی ادب میں تقسیم اور تقسیم کے بعد کے اثرات اور نتائج کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ناولوں میں خاص طور سے سبھی ناول نگاروں نے تقسیم پر کی گئی سیاست کی مخالفت کی ہے ساتھ ہی اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ عوام تقسیم کے المیہ کے حق میں نہیں تھی فرقہ پرست سیاست اور تقسیم پر ہندی میں مختلف ناول تخلیق کئے گئے ۔جس میں کچھ نمائندہ اور مشہور ناول ہیں ۔تمس (بھیشم سہانی) ، جھوٹا سچ (یش پال)،سیدھی سیدھی باتیں (بھگوتی چرن ورما)،دھرم پتر (آچاریہ چترسین شاستری)،کالے کوس (بلونت سنگھ)،آدھا گاؤں (راہی معصوم رضا)،جلوس (فرناشورناتھ رینو) ، سوکھا برگد (منظور احتشام) ان سبھی ناولوں میں ناول نگاروں نے انسانی درد وکرب کی بہترین عکاسی کی ہے ۔''

پس منظر سے جسے انہوں نے (اغوا شدہ اور اغوا کرنے والوں کے ساتھ شادی کے بعد) قبول کرلیا تھا۔ جب یہ خواتین اپنے ملک کے خود کے گھروں میں پہونچیں تو ان کے گھر والوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ ہجرت شدہ اور واپس ہوئی خواتین کے ساتھ گھر والوں کا یہ رویہ کتنا غیر انسانی اور وحشیانہ تھا۔ اس طریقہ کار پر مہا تما گاندھی اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو دونوں نے تنقید کی تھی۔ مہا تما گاندھی جی نے ۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کی پرارتھنا سبھا میں تقسیم کے نمائندگی کے بعد انھیں قبول نہ کئے جانے کی مخالفت کی تھی۔ اس طرح جواہر لال نہرو نے جنوری ۱۹۴۸ء میں ایک اپیل میں کہا تھا کہ "یہ بات بہت ہی نازیبا اور غلط ہے جو فرسودہ سماجی رسم و رواج کی تائید کرتے ہیں وہ قابل مذمت ہے۔ ان خواتین کو ہماری سرپرستی کی ضرورت ہے۔"

اغوا شدہ خواتین کے واپسی کے معاملے میں جنڈر کی اساس پر دوہرا معیار اپنایا گیا۔ تہمینا خان نے The Express Tribune میں شائع اپنے مضمون میں بھارت کے Abducted persons (Recovery and Restoration) کا حوالہ دے کر تحریر کیا تھا۔۔۔ ۱۶ برس کے اوپر کے مردوں کو یہ آپشن دیا گیا تھا کہ وہ جہاں چاہیں وہاں جائیں۔ لیکن خواتین پر حکومت کے ذریعہ ضروری کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت کہا گیا تھا اگر ان کے پاس بچہ ہے تو انہیں وہیں چھوڑ کر آنے کو کہا گیا اگر وہ حاملہ تھیں تو اسقاط حمل کرایا گیا جبکہ اسقاط حمل غیر قانونی عمل تھا۔

ادیبوں نے تقسیم کے واقعات کو غیر جانبدار افراد کے سامنے پیش کرنے کا کام کیا۔ اس میں کچھ خود ہجرت کا دکھ جھیل چکے تھے۔ باقی انسان دوست اور جذباتی ہونے کی وجہ سے شائد یہ ادباء سیدھے طور پر اس المیہ سے لوگوں کی ذہنیت میں جذباتیت کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

تقسیم پر کہانیوں کی لمبی فہرست میں کہانی کاروں نے تقسیم کے بالواسطہ نتائج کے ساتھ ساتھ ان حالات و حوالوں کو بھی مختلف زاویہ سے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے غیر انسانی المیہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی خواتین کے حوالے سے تخلیق کی گئی کہانیاں اور ناول ان کے جذبات و احساسات کو واضح کرتی ہیں۔

دیوندر اسر کی کہانی "مکتی" آزادی کے دوران واقع حادثات و واقعات پر منحصر ہے بالخصوص خواتین کے ساتھ ہوئے زنا بالجبر کے حوالے سے ہے۔ افسانہ نگار اسی جذبہ کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہے کہ کسی طرح نائکی حسیات و عدل کی بھیک مانگتی ہوئی اس دنیا سے آزاد ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ہری کیش سکھ نے اپنی کہانی "عملی" کے توسط سے تقسیم سے پیدا شدہ ذہنی و مالی طور سے مجبور اندرونی طور سے ٹوٹی بکھری خواتین کے درد کی ترجمانی بڑے سلیقے سے کی ہے۔ امرت رائے نے تقسیم کے دور میں عورتوں کی ذہنی کیفیت کی منظر کشی اپنے افسانوں میں کی ہے۔

جہاں ہیروہن رد عمل والی ذہنیت کو منظور نہیں کرتی، اس کا کردار انسانی درد و کرب کو واضح سطح پر ظاہر کرتا ہے ایسا کرب جہاں اس کے جیسا درد و کرب سماج کی مجموعی مظلوم عورتوں کا احوال بیاں کرتی ہے۔

ہندی ادب میں تقسیم اور تقسیم کے بعد کے اثرات اور نتائج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناولوں میں خاص طور سے سبھی ناول نگاروں نے تقسیم پر کی گئی سیاست کی مخالفت کی ہے ساتھ ہی اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ عوام تقسیم کے المیہ کے حق میں نہیں تھی فرقہ پرست سیاست اور تقسیم پر ہندی میں مختلف ناول تخلیق کئے گئے۔ جس میں کچھ نمائندہ اور مشہور ناول ہیں۔ تمس (بھیم سہانی)، جھوٹا سچ (یش پال)، سیدھی سیدھی باتیں (بھگوتی چرن ورما)، دھرم پتر (آچاریہ چترسین شاستری)، کالے کوس (بلونت سنگھ)، آدھا گاؤں (راہی معصوم رضا)، جلوس (فرنا شورناتھ رینو)، سوکھا برگد (منظور احتشام) ان سبھی ناولوں میں ناول نگاروں نے انسانی درد و کرب کی بہترین عکاسی کی ہے۔

خواتین طبقہ کے تئیں غیر انسانی شعور کا بیان

تقسیم کے دوران عورتوں پر زبردست مظالم ہوئے۔ تقسیم کی دہشت میں عورتوں کی عصمت کو پوری طرح سے روند دیا گیا تھا۔ مختلف عورتوں کا اغوا شدہ عورتوں کو انکے کنبہ والوں نے دوبارہ قبول نہیں کیا، اس کی مثال یشپال کے ناول "جھوٹا سچ" میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں بنتی باہری مظالم اور گھر والوں کے درد کی علامت ہے۔ جو گھر والوں کے ذریعہ اخراج کو نامنظور کرتی ہے اور اپنی عفت کو ثابت کرنے کے لئے گھر کی دہلیز پر ہی اپنی جان قربانی کر دیتی ہے۔ بھیشم ساہنی کے ناول تمس کی پرکاشوں کا پتہ ان کے والدین اس لیے نہیں لگا رہے ہیں کیوں کہ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ مل بھی جاتی ہے تو کیا فائدہ۔ تقسیم کے عہد میں غیر انسانی رویوں کی شکار عورتیں جہاں اپنی عصمت کو لٹا کر پہلے سے ہی زخمی تھیں وہیں ان کی لٹی پھٹکی اور غیر منظم رویہ پر جذباتیت کی نظر ڈالنے کے بجائے ان کے ہی کنبہ والے لعن طعن دیتے ہیں۔ اپنی شیخی بگھارتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی یا بہنوں نے ندی میں ڈوب کر اپنی لاج بچائی۔ خواتین پر ہونے والے مظالم کو اپنے وقار کی علامت مانتے ہیں۔ اور انسان مرگیا" رمانند ساگر کا ناول ہے جس میں شرملا کے منسٹر کا کردار وقار کو اولیت دیتا ہے۔ جس کو دیکھ کر پورے معاشرے میں وقار کا مان بلند ہو جاتا ہے۔ اور خواتین کے تئیں ان کا نظریہ الگ نظر آتا ہے۔ عورت چاہے کسی معمولی طبقہ یا مذہب کی ہو اس کا استحصال ہوتا ہے۔ اس ذہنیت کے لوگوں کی سوچ بھی جو اپنی عزت کے لئے مرگئی وہی سب سے اچھی رہی اپنی عورت مجبور و لاچار ہے جو چاہے چھین لے جائے۔ جانے کس کرموں کے پھل سے عورت کا جنم ہوا۔

تقسیم کے دوران خواتین میں نسائیت کو لے کر مرد اور بھی وحشی ظالم ہو گیا تھا۔ دھرتی کی طرح ان کے جسموں کو بھی تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ حالت دونوں ملکوں میں یکساں تھی۔ اور انسان مرگیا، کی نرملا کہتی ہے کہ "دھرتی کی طرح ہمارے جسموں کا بھی بٹوارہ تو انہوں نے کرلیا تھا۔ لیکن ایک عورت ایک ماں کو شائد کوئی بھی اپنے حصے میں لینا نہیں چاہتا تھا۔" تقسیم کے دوران ہوئے تشدد پر جسمانی و ذہنی مظالم بڑے وحشیانہ انداز سے کئے گئے۔ انہیں ہر طرح سے شرمندہ کیا گیا۔ اپنے اعزا سے علاحدگی تو انہیں برداشت کرنا ہی پڑا تھا لیکن بے حس اور شیطانی ذہنیت کے لوگ اسے بے عزت کر کے بہادری و فخر کا احساس کر رہے تھے۔ تقسیم پر منحصر ہندی ناولوں میں عورتوں پر کئے گئے وحشیانہ مظالم کی تصویر کشی ملتی ہے۔ "جھوٹا سچ" میں تارا، بنتی، شیلوں و دوسری عورتیں کسی نہ کسی غیر انسانی مظالم کا شکار ہیں۔ اور انسان مرگیا۔ کی نرملا۔ آننتی نے ناگوار مظالم کو برداشت کیا۔ آننتی مادر زاد، عورتوں کے جلوس میں شامل ہونے کے بعد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔ کچھ اس طرح "کالے کوس" کی گووندی جلوس کی طہارت، تمس کی پرکاشوں نے خواتین پر ہوئے مظالم کے الگ الگ پہلوؤں کا اظہار کیا ہے۔ یگیہ آدتیہ شرما اپنے ناول "انسان" میں لکھتے ہیں کہ عورت ذات کی جو بے عزتی ہوئی وہ تاریخ میں ہندو پاک کے لیے بدنما داغ بنا ہے جس کا سیاہ داغ غالباً مستقل قریب میں آنے والی نسلیں اسے دھو کر بھی ہٹا نہیں سکیں گی۔

ہندی ادب کے علاوہ اردو ادب میں تقسیم پر بہت سے ناول اور افسانے تخلیق کئے گئے ہیں۔ جن میں تقسیم ہند کے بعد ہونے والے معاملات اور فسادات کے دوران ہونے والے وحشیانہ ذہینیت کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور تقسیم پر جو ناولیں لکھی گئیں تقریباً سبھی ناولوں میں عورت پر ہونے والے مظالم بیان کئے گئے ہیں۔ اور تقریباً سبھی ناولوں میں خواتین کے احساسات و کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان پر ہونے والے مظالم کی داستان بالخصوص قدرت اللہ شہاب کے ناول "یا خدا" کے ذریعہ ناول کے مرکزی کردار شمشاد جو خوبصورت اور تنہا لڑکی ہے اس کی بے کسی اور مجبوریوں کے کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑے پر اثر انداز میں کی گئی ہے جو ہوس پرستی کا شکار ہوئی ہے جس کے باعث اس پر بے بسی طاری ہو جاتی، ہے اپنی عصمت لٹ جانے کے بعد اس کا احساس بھی زائل ہو جاتا ہے۔ کرشن چندر کا ناول "غدار" تقسیم پر لکھا گیا ناول ہے اس میں ہجرت کے دوران ہونے والے دل سوز فسادات میں خواتین پر ہونے والے مظالم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انسانیت کو شرم سار کرنے والے واقعے پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح خدیجہ مستور کا ناول "زمین" جس میں ایک بوڑھا باپ اپنی لڑکی کے لئے کراہ رہا ہے کیوں کہ ہجرت کے دوران

اسے ہندوستان سے آتے ہوئے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اس پس منظر میں ناول تقسیم اور اس میں ہونے والے عورتوں کے مصائب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ رمانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' تقسیم پر مشہور ناول ہے۔ ناول نگار نے تقسیم کے المیہ کی عکاسی بڑے جذبات اور دردمندانہ طریقے سے کی ہے۔ رمانند ساگر نے انسان اور انسانیت کو مرتے ہوئے دیکھا۔ بلونت سنگھ کا ناولٹ ''ایک معمولی لڑکی''، جملہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' خاص ہیں۔

اسی طرح تقسیم سے پیدا شدہ حالات فرقہ وارانہ فسادات اور اس سے پیدا شدہ تناظر سے بے شمار افسانے اردو میں تخلیق کئے گئے۔ یہ افسانے لا تعداد خواتین کی بے چارگی اور ان پر ہونے والے وحشیانہ مظالم کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر ان افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایک زندہ تاریخ نظر آتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات میں زیادہ تر مرد کی ہوس پرستی کا شکار مظلوم عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ اردو کے فکشن نگاروں نے حالات، واقعات اور اس خونی حادثے کا کرب پیش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ان مظلوم عورتوں کی لاچاری بے کسی اور مجبوری کو بیان کیا ہے جو اپنی عزت و عصمت بھی نہیں بچا سکیں۔ اردو کی ان موضوع پر لکھی گئی کہانیوں میں حیات اللہ کا افسانہ ''ماں بیٹا''، ''شکر گزار آنکھیں''، بطور خاص ہیں۔ کرشن چندر کے 'آزادی سے پہلے' 'ہم وحشی ہیں'، 'پشاور ایکسپریس افسانے'، عورتوں پر ہونے والے جرم و جبر کے عکاس ہیں جو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' دل دہلانے والا نمائندہ افسانہ ہے۔ جو فسادیوں کے ظلم و خوف کا ترجمان ہے۔ ان کا دوسرا افسانہ ہے ''محمودہ کی ہیروئن'' ہے فسادات پر عصمت کا افسانہ 'جڑیں'' اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح احمد ندیم قاسمی کا ''پرمیشور سنگھ'' 'میں انسان ہوں'' اور راجیندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی'' اس خونی حادثہ کے کرب کو پیش کرتا ہے۔ تقسیم اور اس سے پیدا شدہ فسادات میں خواتین پر ہوئے ظلم و جور کی ترجمانی کرتے ہوئے اردو ادب میں بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عزیز اسرائیل ''ان افسانوں میں ہمارے افسانہ نگار فسادات میں ایک عورت پر ہونے والے ظلم کی داستان پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔''

(اشاریہ اردو ریسرچ جرنل: عزیز اسرائیل)

مختصر یہ کہ ہمارے سماج و معاشرے میں عورتیں طرح طرح کے مظالم برداشت کرتی رہی ہیں۔ وہ مردوں کی بالا دستی کے خلاف سماج و معاشرے کے خوف سے اپنی آواز بلند کرنے سے قاصر رہیں لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے عورتیں خود پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں لیکن ابھی بھی ان عورتوں کا فیصد بہت کم ہے۔ بالخصوص فسادات میں ان پر بہت ظلم ڈھائے جاتے ہیں ان کی عزت و عفت کو ہی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کمزور طبقے کو مٹی میں ملانے کی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ تقسیم ہند کے ۷۷ ربرس بعد بھی خواتین سے متعلق آئے دن سماج میں عصمت ریزی کی خبریں آتی رہتی ہیں۔

حوالہ:

یش پال۔ چھوٹا سچ جلد ۲ (دیش کا بھویش ص ۹۹)
بھیسم ساہنی۔ تمس ص ۲۱۸ ص ۲۰۰۹ء
فرانشر ناتھ رینو۔ جلوس ص ۶۱
بھارت وبھاجن کی شریشٹھ کہانیاں، ایڈیٹر ڈاکٹر نریندر سنگھ موہن
Women and partition edited by Urvashi Butalia
Boards and Boundries: women in indian partiation-Bhasin Kamala & menon Ritu
اشاریہ اردو ریسرچ جرنل: محمد یٰسین غنی، تقسیم ہند، عورت اور اردو فکشن۔

❑❑❑

غزل

دل میں جذبہ جگا گیا کوئی
میرے اندر سما گیا کوئی

عکس اسی کا ہی دیکھتی ہوں میں
آئینہ مجھ کو بنا گیا کوئی

ڈوبتی ہوں کبھی ابھرتی ہوں
مجھ کو دریا بنا گیا کوئی

دیکھتی رہتی ہوں اس کو میں
ایسا کاجل لگا گیا کوئی

اس کی قربت میں نشہ تھا ایسا
جانے کیا کیا دکھا گیا کوئی

خواب کی تعبیر کیا ہو میری
میرا دامن جلا گیا کوئی

اس کا چہرہ بسا ہے آنکھوں میں
دل سے سب کچھ بھلا گیا کوئی

دنیا لگنے لگی نسیمہ حسیں
میرے خوابوں میں آگیا کوئی

نسیمہ لکھنوی
ایل ڈی اے بلڈنگ فورتھ لین، نشاط گنج، لکھنؤ
7388899157

غزل

تم رفتہ رفتہ سب کی نظر سے اُتر گئے
اپنا ضمیر بیچ کے بے موت مر گئے

دیکھا ہے وقت نے حق و باطل کی جنگ میں
دستار جو بچاتے رہے اُن کے سر گئے

سینہ سپر کئے سرِ مقتل کھڑے ہیں ہم
وہ اور لوگ ہوں گے جو مرنے سے ڈر گئے

اک در پہ سجدہ ریزی میں جن کو یقیں نہیں
وہ کاسۂ گدائی لئے در بہ در گئے

آخر جنونِ عشق کا انجام یہ ہوا
اُس کی طلب میں سرحدِ جاں سے گذر گئے

جب سے پڑا ہے مجھ پہ بُرا وقت دوستو!
کچھ لوگ آس پاس تھے جانے کدھر گئے

مخمورؔ سے ادا نہ ہوا عاشقی کا حق
منصور تھے جو ہنستے ہوئے دار پر گئے

مخمورؔ کاکوروی
چودھری محلہ، کاکوری لکھنؤ
9450097929

غزل

رُت بسنتی آگئی
آ کے گُل بُوٹوں کے گہنے دھرتی کو پہنا گئی
تتلیاں ہیں اُڑتی پَر سَت رنگی پھیلائے ہُوئے
کلیوں پَر منڈرا رہے ہیں بھنورے للچائے ہُوئے
جاگتی آنکھوں میں سپنے بُننے کی رُت آگئی
بَور کی خوشبو سے مہکے مہکے ہیں باغ آموں کے
اوڑھ لی پیلی چُنرِیا سب کھیتوں نے سرسوں کے
کِھلنے کو بیکل کلی بھی اوڑھنی سَرکا گئی
دِل کو آنکھوں میں دھڑکتے رہنے کا ڈھنگ آگیا
خامشی کو بھی بہت کچھ کہنے کا ڈھنگ آگیا
یاد پردیسی سجن کی سجنی کو تڑپا گئی
دُور اب اپنے کناروں سے ہے مَدماتی ندی
سِمٹی اپنے آپ میں اِٹھلاتی بَل کھاتی ندی
بات اُبھرنے ڈوبنے والی سمجھ میں آگئی
چارپائی آگئی دالانوں سے انگنائی میں
رعب اب باقی نہیں ہے جاڑے کی ٹھکرائی میں
الگنی پر بیٹھ کر گوریّا یہ سمجھا گئی
رنگ بدلا انگ انگ کا چال بہکی بہکی ہے
گدرایا گدرایا یوَون کایا مہکی مہکی ہے
لہرائیں تَن مَن پھاگُن کی اِن پہ مستی چھا گئی
اے نیازؔ آنکھوں میں ہے تصویر جیراجپور کی
فخرِ ہندوستان کی اور اعظم گڑھ کے نور کی
یادیں میرے گاؤں کی سنگ اپنے لیکر آگئی

نیازؔ جیراجپوری
جالندھری، اعظم گڑھ، یوپی
9935751213

غزل

دل میں اک یاد ہے،عید کے روز بھی
کوئی ناشاد ہے، عید کے روز بھی

کوئی بچھڑا ہوا، یاد آئے بہت
پھر بھی دل شاد ہے، عید کے روز بھی

غم زدہ ہے کوئی اور کوئی بن مرے
شاد و آباد ہے عید کے روز بھی

عید کیا، اور ہے عید کا جشن کیا
لب پہ فریاد ہے، عید کے روز بھی

زندگی، زندگی، زندگی، زندگی
ایک افتاد ہے، عید کے روز بھی

آج بھی ہار اپنے گلے کا وہی
عشق بے داد ہے ، عید کے روز بھی

دل دکھانے کی انجم، یہ رسم غلط
کس کی ایجاد ہے، عید کے روز بھی

فریدہ انجم
پٹنہ سٹی
8235851828

غزل

ٹوٹ جاتی ہے دوستی اکثر
بات کہتا ہوں میں کھری اکثر

سیٹھ کنجوس ہے بہت میرا
روک لیتا ہے لیبری اکثر

یار، کیا چیز ہے یہ عورت بھی
گھوم جاتی ہے کھوپڑی اکثر

آدمی چھوٹا ہے بہت لیکن
بات کرتا ہے وہ بڑی اکثر

ٹوٹ جاتا ہے شہر سے سمپرک
راہ میں آتی ہے ندی اکثر

بالیقیں کامیاب ہوں گے ہم
تھوڑی رہ جاتی ہے کمی اکثر

دور رہتا ہے علم سے جو نفیس
جھیلتا ہے وہ کمتری اکثر

نفیس وارثی
محلہ ڈیہ پور، کھیری ٹاؤن، ضلع کھیری
7379302972

رضوانہ پروین

۸۹ / ۶۱۷، اجریاؤں عیدگاہ، وجے کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ

9452775502

افسانہ

زندگی کی رفتار

تیز رفتار بھاگتی دوڑتی زندگی سے قدم سے قدم ملانے کیلئے وہ بھی کوشاں تھی اس نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی صبح کے نو بج گئے تھے اور وہ ابھی تک گھر کے کاموں سے فراغت حاصل نہیں کر پائی تھی وہ برق رفتاری سے کاموں کو انجام دے رہی تھی تاکہ آج پھر اُسے آفس کیلئے دیر نہ ہو جائے وہ جلد سے جلد آفس پہنچ سکے دو دِن سے چھوٹے بیٹے کو بخار آرہا تھا ڈاکٹر کو بھی دِکھا کر لائے تھے دوا وغیرہ بھی وقت پر دی جا رہی تھی مگر کوئی افاقہ نظر نہیں آرہا تھا۔ رات بھر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے کب صبح ہوگئی پتہ ہی نہیں چلا صبح ہوتے ہوتے رزم کا بخار کچھ ہلکا ہو گیا تھا اس نے جلدی سے رزم کا ہاتھ منھ دھلا کر کپڑے بدل دیئے شوہر پہلے ہی آفس جا چکے تھے رات بھر انہوں نے اسے رزم کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھ کب لگ گئی اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا سنیل نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا اور آفس چلے گئے تھے رزم کو ناشتہ دے کر وہ تیار ہونے چلی گئی دس منٹ میں ہی وہ آفس کیلئے تیار ہو کر باہر آگئی تھی رزم کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھر کے باہر آگئی دروازے کو لاک کرتے ہوئے اس نے سڑک کے دوسری طرف آٹو کو رُکنے کا اشارہ کیا آفس کا پتہ بتا کر اس نے رزم کو اپنے سے قریب کر لیا آٹو اپنی پوری رفتار میں تھا۔

آفس پہنچ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی آج وہ آفس وقت پر پہنچ گئی تھی وہ نُورزم ڈپارٹمنٹ میں H.R. کے عہدے پر تھی دو دن سے لیٹ ہونے پر وہ باس کی ڈانٹ ڈپٹ کا شکار ہو رہی تھی رزم کو ساتھ دیکھ کر نرملا کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ وہ آج رزم کو بخار تیز ہو گیا تھا سنیل امن کو لے کر اسکول گئے ہیں اسکول میں آج پیرنٹس میٹنگ ہے اس کے بعد وہ آفس جائیں گے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ سنیل کو چھٹی نہیں مل رہی ہے واپسی میں رزم کو ڈاکٹر کو بھی دکھانا ہے یہ کہتے ہوئے اس نے رزم کو پاس پڑے ہوئے اسٹول پر بٹھا دیا آفس پیون پون رزم کو دیکھ کر پاس آگیا تھا۔ رزم کیسے ہو۔۔۔۔؟ پون نے پوچھا رزم کچھ نہ بولا سنگیتا نے پون کو کچھ روپیے پکڑاتے ہوئے کہا پون بھیا اسے ساتھ لے جاؤ رات بھر اسے بخار رہا ہے طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے ذرا اس کا خیال رکھنا۔ میں آفس کا کام نپٹا لوں۔ پون نے روپیے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔۔ میڈیم آپ بے فکر رہیں! پون نے رزم کا ہاتھ پکڑ کر کہا چلو بھئی ہم لوگ کچھ نئے نئے گیم کھیلیں گے رزم مسکرایا سنگیتا نے کہا چلو پھر لنچ پر ملتے ہیں۔

سنیل ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے والدین گزر چکے تھے ان کا آبائی گھر گاؤں میں تھا۔ پڑھائی کی وجہ سے وہ شہر آگئے تھے ایک بہن تھی جسے پڑھا لکھا کر شادی کر دی تھی اور وہ امریکہ سیٹل تھی۔ سنیل ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے تھے والدین کی دیکھ بھال بہن کی شادی پھر خود کی شادی اور اب یہ دو بچے ان کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ خرچ پورے ہو سکیں۔ بہن کی شادی انہوں نے بڑی دھوم دھام سے کی تھی لڑکے والے مالی حیثیت سے کافی مضبوط تھے اس کے شوہر کا کافی بڑا بزنس تھا شاید اسی وجہ سے وہ لوگ ہم لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے کہ ہم لوگ مالی حیثیت سے ان کی برابری کے نہیں تھے اگر کبھی وہ آتے بھی تو ہم لوگوں کے ساتھ رہنے کے بجائے ہوٹلوں کو ترجیح دیتے تھے ہمارا گھر بہت بڑا تو نہیں تھا مگر اتنا بڑا ضرور تھا کہ ہم سب ساتھ رہ سکیں۔ ہوٹلوں میں رُک کر شاید یہ احساس دلاتے تھے کہ جیسا طرز زندگی ان کا ہے ہم سب کا نہیں۔ سنیل اور ہم دل مسوس کر رہ جاتے لیکن اگر کبھی وہ گھر کا رُخ کر بھی لیتے تو سنیل ان سب کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں رکھتے تھے حالانکہ یہ مواقع سنیل کو کم ہی میسر ہوتے۔ امیری غریبی کی یہ خلیج ہمیشہ ہم سب کے درمیان موجود رہتی اور سنیل کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوتا کہ وہ بھی اپنوں سے باتیں کریں گھومیں پھریں اور جتنا وقت ہو مل کر گزاریں مگر اپنوں کے ساتھ کی جگہ اپنی سہولتوں کو ترجیح دیتا ہوٹلوں میں ٹکنا زمانے کا ٹرینڈ ہو چکا ہے اور اُس خلوص و محبت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جو پہلے اپنوں سے ملا کرتی تھی۔

آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا وہ رزم کو لے کر آفس سے باہر آئی اور رزم کو ڈاکٹر کو دکھاتے ہوئے دوا لے کر گھر آگئی تھی ''سنگیتا'' سنیل کی آواز سن کر وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی امن کا ہاتھ تھامے سنیل تھکے ہارے اندر آگئے تھے سبزیوں کا تھیلا اُسے پکڑا کر بیگ اتار کر میز پر رکھ دیا تھا

> ''امن ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا اور چھوٹا بیٹا سول انجینئر وہ دونوں بہت خوش تھے دونوں بیٹے اس کے لئے فخر کا باعث بن چکے تھے دونوں نے اپنے ساتھ پڑھنے والی نتاشا اور رانا میکا کو بھی ملا یا تھا ماں ان کے دِل کی حالت سمجھ چکی تھی اس نے ان کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ اس کی فکر دوگنی ہوگئی تھی اب وہ جلد سے جلد ان دونوں کی شادی کر دینا چاہتی تھی جتنی بھی جمع پونجی تھی وہ ان کی پڑھائی لکھائی پر خرچ کر چکی تھی ایک چھوٹا سا گھر تھا اور ایک پلاٹ جسے اس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی گئی رقم سے لیا تھا۔ آڑے وقت میں کام آنے کے لئے اس نے وہ پلاٹ بیچ کر دونوں کی شادی کر دی تھی اب وہ اور سنیل رہ گئے تھے بچے جا چکے تھے۔ سنیل ریٹائرڈ ہو چکے تھے اب وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے دونوں بچے اپنی زندگی میں خوش تھے دونوں نے اپنا اپنا گھر لے لیا تھا۔ دونوں باہر ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ملنے آتے تھے ان دونوں کو خوش دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوتے۔''

امن کا اسکول صبح آٹھ بجے سے دو بجے دن تک تھا پھر وہ کوچنگ جاتا اور وہاں سے اسٹیڈیم جہاں وہ بیڈمنٹن کی پریکٹس کرتا تھا۔ سنیل اپنی شفٹ کے ختم ہونے کے بعد اسے پک کرتے ہوئے آتے تھے۔ سنگیتا نے انہیں پانی کا گلاس پکڑایا اور امن کے بیگ اور جوتوں کو صحیح جگہ پر رکھتے ہوئے کچن میں آگئی۔ ڈاکٹر کو دکھلائیں؟ سنگیتا کو سنیل کی آواز سنائی پڑی "ہاں دکھلائی وہ ٹائیفائیڈ کا اندیشہ جتا رہا ہے ٹسٹ کرانا پڑے گا رپورٹ آنے پر پتہ لگے گا۔ اس نے جواب دیا۔ سنیل نے کہا اچھا اور رزم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہانے چلا گیا۔ سنگیتا نے چائے تیار کر کے میز پر لگادی اور بچوں کی من پسند میگی بھی، امن نہا کر آگیا تھا وہ ہائی اسکول میں تھا وہ آئی۔ اے۔ ایس بننے کا خواب پورا کرنے کیلئے محنت کر رہا تھا چائے پینے کے بعد سنیل بھی اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ آفس ورک میں جٹ گئے تھے امن ہوم ورک پورا کرنے میں اُس نے میز پر سے کھانے پینے کا سامان سمیٹتے ہوئے کچن کی راہ لی شب و روز یونہی گزر رہے تھے۔

یہ شب و روز کب ماہ میں اور ماہ کب سال میں بدل گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ بچوں کی پڑھائی کیلئے وہ بہت الرٹ تھی اس کی جمع پونجی یہی بچے تھے ان بچوں میں ہی وہ اپنے دیکھے ہوئے خوابوں کی تکمیل ڈھونڈھتی تھی اس کا شوہر پرائیویٹ کمپنی میں جاب کر رہا تھا مگر اس کی سیلری گھر کے بڑھتے ہوئے خرچوں کو پورا کرنے سے قاصر تھی اس نے بھی حالات و بڑھتے ہوئے خرچوں کو دیکھ کر گھر بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا اور نوکری کا دامن تھام لیا وقت پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ آخر اس کے خوابوں کی تکمیل کا وقت آچکا تھا ان دونوں کی اور بچوں کی محنت رنگ لاچکی تھی۔

امن ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا اور چھوٹا بیٹا سول انجینئر وہ دونوں بہت خوش تھے دونوں بیٹے اس کے لئے فخر کا باعث بن چکے تھے دونوں نے اپنے ساتھ پڑھنے والی نتاشا اور رانا میکا کو بھی ملایا تھا ماں ان کے دِل کی حالت سمجھ چکی تھی اس نے ان کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ اس کی فکر دوگنی ہوگئی تھی اب وہ جلد سے جلد ان دونوں کی شادی کر دینا چاہتی تھی جتنی بھی جمع پونجی تھی وہ ان کی پڑھائی لکھائی پر خرچ کر چکی تھی ایک چھوٹا سا گھر تھا اور ایک پلاٹ جسے اس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی گئی رقم سے لیا تھا۔ آڑے وقت میں کام آنے کے لئے اس نے وہ پلاٹ بیچ کر دونوں کی شادی کر دی تھی اب وہ اور سنیل رہ گئے تھے بچے جا چکے تھے۔ سنیل ریٹائرڈ ہو چکے تھے اب وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے دونوں بچے اپنی زندگی میں خوش تھے دونوں نے اپنا اپنا گھر لے لیا تھا۔ دونوں باہر ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ملنے آتے تھے ان دونوں کو خوش دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوتے جیسے یہ کامیابی کی سیڑھیاں ان لوگوں نے ہی چڑھی ہوں تو وہ انہیں دنیا کے افق پر سورج کی طرح چمکتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی جس کی روشنی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دے اور اس روشنی میں وہ دونوں نہا جائیں۔

وقت اور حالات بدلے مگر اس کے شب و روز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اس کے لئے زندگی سچ مچ جدو جہد کا نام تھا اس جدو جہد میں آپ سے بہت کچھ چھوٹ جاتا ہے ہم اپنوں کو گنوا دیتے ہیں رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں تو کچھ جڑ بھی جاتے ہیں مگر ان ٹوٹتے بچھڑتے رشتوں کے درد کا بہت افسوس نہیں کرنا چاہئے کیونکہ کچھ رشتے جہاں چھٹ کر درد دیتے ہیں وہیں کچھ جڑ کر رستے ہوئے زخموں اور آنسوؤں کا حساب خوشیوں سے کر دیتے ہیں اندھیرے اور اُجالے زندگی کے دو رُخ ہیں جہاں خوشیاں ہیں وہیں غم بھی ہیں۔

سنیل کو اچانک فالج اٹیک ہوا اس نے گھر پر رہ کر سنیل کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا نوکری چھوڑ دی بچوں اور اس نے بہت خدمت کی اسپتال میں کافی دن زیر علاج رہے حالت بہتر ہونے پر وہ لوگ سنیل کو گھر لے آئے بچے بھی کچھ دن رہنے کے بعد اپنی اپنی نوکری پر واپس جا چکے تھے اور اب وہ اور سنیل ہی گھر پر رہ گئے تھے سنیل بستر پر تھے بیمار اور وہ جیسے اکیلی ہوگئی تھی مگر اس نے اپنے اکیلے پن کو اپنی طاقت بنا لیا تھا وقت گزرتا گیا اور بدلاؤ آتا گیا اور اُسے یہ سکھا گیا کہ زندگی تو ایسا سفر ہے جہاں آپ کو رُکنا تو ہے ہی نہیں اگر آپ رُک جاتے ہیں تو زندگی آپ سے دُوگنا تاوان وصول کر لیتی ہے مگر وہ تو زندگی کے مدمقابل آچکی تھی۔

کچھ وقت تک تو بیٹے باری باری آتے رہے مگر دھیرے دھیرے ان کے آنے میں کمی آنے لگی ان کے اپنے اپنے وسیع و عریض آسمان تھے ان کے پروں کی طاقت انہیں اونچا اور اونچا اُڑنے کی ترغیب دے رہی تھی ان سب کو اپنے اپنے وہ خواب سچ کرنے تھے جو اس چھوٹے سے گھر سے کبھی ممکن ہی نہیں ہوئے ان کی بیویاں اس چھوٹے سے گھر میں آنے میں اپنی توہین سمجھتی تھیں اگر وقتی طور پر آبھی گئیں تو ان پر اور بچوں پر انفیکشن کا خطرہ منڈلانے لگتا تھا۔ بچوں کو ان دونوں کی دسترس سے دور رکھا جاتا تھا اور اب مالی پریشانیوں کا ذکر بھی ہونے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے رشتے اپنی چمک کھو رہے تھے اور ان دونوں کے چہروں کی چمک بھی معدوم ہوتی جا رہی تھی اُمیدیں، مایوسی میں بدل رہی تھیں آئینے میں سچ نظر آنے لگا تھا۔ حالات سے خود ہی لڑنا ہے کوئی دوسرا تیسرا نہیں آنے والا یہ وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ شجر کے پرندے اُڑ چکے تھے نئے گگن کی تلاش میں سنیل کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی، ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا تبھی ایک المناک حادثے نے اس کی زندگی پوری طرح بدل دی تھی۔ سنیل ساتھ چھوڑ گئے تھے اور وہ جوان کے سہارے زندگی کی ہر بازی جیت رہی تھی اچانک ہار گئی تھی۔

تمام فضول کے رسم و رواج چھوٹی سی ہمدردی کے بیچ رشتے دار ایک ایک کر کے جا چکے تھے، اس کا چھوٹا سا گھر سونا ہو چکا تھا۔ سنیل جو نہیں تھے وہ اپنے آپ کو بڑا اکیلا سا محسوس کر رہی تھی وہ رہ رہ کر سسک اُٹھتی یہ اکیلا پن اور سناٹا انسان کو زندگی کا بہتر ڈھنگ سے سمجھنے کا موقع دیتا ہے۔ سنیل جو اس کا آسمان تھے جن کی وجہ سے زندگی میں اندر دھنش کے رنگ تھے اب پھیکے پڑ چکے تھے۔ دونوں بیٹوں کے سامنے ایک سوال منہ پھاڑے کھڑا تھا ماں کہاں رہے گی؟

چھوٹے بیٹے نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگلے ہفتے وہ جرمنی جا رہا ہے کمپنی کی طرف سے اتنی جلدی ماں کو اپنے ساتھ لے جانا ممکن ہی نہیں ہے فیملی بھی ساتھ جائے گی دوسرے دن ہی وہ واپس جا چکا تھا آخر بڑا بیٹا اسے اپنے ساتھ لے گیا وسیع و عریض بنگلہ جس کے ہر حصے سے رئیسی کی بو آرہی تھی گیٹ پر مستعد چوکیدار نے لپک کر گیٹ کھولا گاڑی اندر داخل ہو کر بڑے سے پورچ میں جا کر رک گئی تھی ارد گرد ہرا بھرا لان قرینے سے قطار میں سجے ہوئے پھولوں کے گملے اس نے گرد و پیش پر نظر ڈالی آج وہ پہلی بار اپنے بیٹے کے گھر آئی تھی۔ آؤ ماں بیٹے کے کہنے پر وہ گاڑی سے اتر آئی تھی بہو بھی آگئی تھی اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف دیکھے جاسکتے تھے مگر وقت کی نزاکت اور شوہر کی وجہ سے وہ کچھ کہہ نہیں پائی اس نے ان کا ہاتھ تھاما اور اندر لے گئی گھر کی ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی رات اس کا بستر رانو کے کمرے میں اس کے بستر کے پاس ڈالا گیا عذر یہ دیا گیا رالو اس کی دیکھ بھال کرتی رہے گی رالو یہاں کی وفادار نوکرانی تھی۔

ایک نئی صبح اس کی منتظر تھی صبح عادت کے مطابق وہ جلدی اُٹھ گئی تھی منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن کی طرف گئی بہو کے کمرے سے آواز آرہی تھی بہو کہہ رہی تھی چھوٹے بھیا بہت چالاک ہیں ہمارے گلے مصیبت مڑھ دی اور خود پیچھا چھڑا کر آرام سے چلے گئے اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ بیٹا کہہ رہا تھا ہاں یہ تو ہے مگر اب کیا کیا جاسکتا ہے ان کو پھینک تو سکتا نہیں زمانہ کو بھی منہ دکھانا ہے مجبوری ہے کچھ دن جھیل لو پھر دیکھتا ہوں نہیں تو اولڈ ایج ہوم کا آپشن ہے اپنے ساتھ تو نہیں رکھ سکتا۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے تھے وہ کچن سے اُلٹے پیروں واپس آگئی تھی اس کا سر چکرا رہا تھا جیسے پوری کائنات گردش میں آگئی ہو وہ کچھ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھی اس نے بیڈ کا ایک کونا تھام لیا تھا جیسے وہ اپنا توازن قائم رکھنا چاہ رہی ہو۔ رانو اس کے پیچھے اس کو پکارتی ہوئی آگئی تھی وہ اس کے لئے چائے بنا کر لائی تھی چائے کا کپ اس کے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے کہا میم صاحب نے کہا ہے کہ آپ کا ناشتہ آپ کے کمرے میں ہی پہنچا دیں تو بتائیں آپ کیا کھائیں گی؟ جلدی بتائیں مجھے ابھی بہت سارے کام ہیں مالی بھی آگیا ہے ابھی پرانے پیڑ پودوں کو ہٹوا کر نئے لگوانے ہیں رانو بولتی جا رہی تھی اور وہ اسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

اس نے اس لئے تو اپنے آپ کو نہیں مٹایا تھا وہ سوچ رہی تھی اس نے تو اپنے بچوں کو اس وسیع و عریض آسمان میں پرواز کے لائق بنایا تھا مگر اُڑتے ہوئے وہ اتنی دور نکل جائیں گے یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ گھونسلہ خالی ہو چکا تھا اسے سامنے کھڑکی سے صاف نظر آرہا تھا مالی پرانے پیڑ پودوں کو تیزی سے کاٹ رہا تھا نئے پودوں کو لگانے کیلئے۔ بیٹا آفس جا رہا تھا اس نے یہ زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ ماں کے کمرے میں جھانک لے اور کہہ دے ماں میں آفس جا رہا ہوں بیوی اسے سی آف کر کے اندر کمرے میں جا چکی تھی اور وہ حیران و پریشان اجنبی سی کھڑی رہ گئی تھی۔

اچانک وہ حرکت میں آئی اس نے چپکے سے اپنا بیگ اٹھایا اور گیٹ سے باہر آگئی باہر آ کر اس نے آٹو روکا اپنے پرانے گھر کا پتہ بتا کر اس نے سکون کی سانس لیتے ہوئے اپنی پیٹھ سیٹ سے ٹکا دی۔

❑❑❑

احتشام الحق آفاقی

تھانہ کنڈا، نزد شاہ آباد، رامپور

7060695172

افسانہ

بے رخیٔ چمن

بیٹی، روئے زمین پر انسانوں کیلئے سب سے حسین ترین نعمت ہے۔ کہتے ہیں جس کے گھر میں بیٹی نہ ہو وہ گھر سونا سونا ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔۔۔۔ بیٹی کی ذات تو عورت سے منسلک ہوتی ہے۔ اور عورت محبت، عشق جنون، آنکھوں کی ٹھنڈک، دل سرور، سر پر بٹھانے والی چیز ہوتی ہے۔ یہ جب تک ماں باپ کے گھر میں ہوتی سب کے آنکھوں کا تارا بن کر رہتی ہے اور جب ماں باپ کے گھر سے وداع ہو کر جاتی ہے تو ایک نئی دنیا کو آباد کرتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں ساس سسر کا پاس ولحاظ، شوہر کے بھائی بہنوں سے انسیت ومحبت اور پھر شوہر واپنی گھر گرہستی۔۔۔ اس طویل سفر میں ایک عورت کے مختلف مراحل گزرتے ہیں جس میں دکھوں کا بھی سامنا ہوتا اور تکالیف سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ان تمام مراحل کو ایک عورت خوشی بخوشی قبول کرتے ہوئے زندگی گزارتی ہے۔

''پتہ نہیں اس لڑکی کو کب عقل، سلیقہ آئے گا، شادی کے کچھ ہی دن رہ گئے ہیں اور ان کو ابھی کوئی سلیقہ ہی نہیں آیا ہے۔'' عبرت نے لبنا پر جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ''امی آپ بھی نا! میں سیکھ تو رہی ہوں سب کچھ۔ اور میں کیا کر سکتی ہوں۔ بچپن سے تو آپ نے مجھے پلکوں پر بٹھا کر رکھا۔ اب جب کہ میری شادی کے دن نزدیک آئے ہیں تو سب کچھ ایک ہی دن میں سکھانا چاہتی ہیں۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔'' لبنا ماں کی جھنجھلاہٹ کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''اپی دیکھو! امی جو کچھ سکھا رہی ہیں تم اس کو جلدی جلدی سیکھ جاؤ۔ ورنہ سسرال میں سب تمھیں پھوہڑ کہیں گے اچھا تو نہیں لگے گا۔'' اقرا نے لبنا کو چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چپ کر مینٹل پیس! تم تو چاہتی ہی ہو نا کہ میری جلدی سے شادی ہو جائے اور تم اس گھر میں راج کرو۔ اور سب کے آنکھوں کا تارا بن کر رہو۔''

''اب تم دونوں لڑنا بند بھی کرو۔ جب دیکھو لڑنے کیلئے تیار بیٹھی رہتی ہو۔ جلدی جلدی کام نمٹاؤ'' عبرت نے دونوں بیٹیوں سے کہا۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے ٹرنگ۔۔ ٹرنگ۔۔۔ ٹرنگ۔۔۔ ٹرنگ ''اقرا بیٹا جا کر دیکھو کون آیا ہے۔'' عبرت نے اقرا کو دروازہ کھولنے کیلئے کہا۔ ''السلام علیکم! آنٹی کیسی ہیں آپ!'' جبران نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔

عبرت: ''کہو بیٹا جبران کیسے آنا ہوا۔''

جبران: ''آنٹی مجھے ادھر کچھ کام تھا تو امی نے کہا کچھ چیزیں آپ تک پہنچا دوں۔''

عبرت ''جبران تم بیٹھو میں چائے لے کر آئی۔''

جبران تکلفاً منع کرتے ہوئے ''ارے آنٹی چائے شائے کی ویسے کوئی ضرورت ہے نہیں، اگر ایک گلاس پانی مل جائے تو بہتر ہے۔

عبرت: ''نہیں بیٹا بغیر چائے کے کوئی مہمان گھر سے واپس جائے۔ اچھا تو نہیں لگتا۔''

عبرت اپنے ہونے والے داماد کیلئے چائے بنانے جاتی ہے۔ اور ان کے ساتھ میں لبنا بھی چلی جاتی ہے۔ شادی میں صرف چند دن رہ گئے ہیں اور لبنا گھر کو سنبھالنے کے معاملہ میں بالکل اجنبی ہے۔ اس لئے ماں کا حکم ہے کہ وہ ہر وقت ان کے ساتھ میں رہے اور جو کچھ کرتا دیکھے وہ اس کو سیکھ لے۔ بیٹی تو ہوتی ہی ایسی ہے۔ کبھی تو ان سے ایک تنکا اٹھانے کا کام نہیں لیا جاتا اور کبھی سارا بوجھ ان کے سر پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ غیروں کے گھر میں جا کر ماں باپ کی جگ ہنسائی نہ ہو۔

جبران: ''اقرا تمھاری بہن دیکھ کر بھاگ کیوں گئی۔''

اقرا: ''بھائی جان! آپ تو جیسے سمجھتے ہی نہیں۔ شادی سے پہلے لڑکیاں اپنے منگیتر کو دیکھ کر ایسے ہی بھاگتی ہیں اور وہ ویسے بھی چند دنوں کی مہمان ہیں ہمارے یہاں۔''

> ''رفتہ رفتہ زندگی کے شب وروز گزر رہے تھے۔ لبنا اپنے تمام رشتوں کو نبھانے میں پوری طرح مصروف تھی۔ لیکن رشتوں کو صرف پیار ومحبت کی بنیاد پر قائم رکھنا ہی جانتی تھی۔ قریب قریب ایک سال کا وقفہ گزرنے والا تھا۔ لبنا اپنے گھریلو کاموں کے تئیں ملنے جلنے والوں، ان کو بٹھانے، چائے ناشتہ پوچھنے، شوہر کے کاموں کا خیال رکھنے، گھر میں رہنے والے لوگوں کے خاطر داری کے شعور سے اب بھی پوری طرح نا آشنا تھی۔ جس کی وجہ سے لبنا کو بارہا اپنے شوہر سے ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک روز آفس سے آنے کے بعد معمول کے مطابق غلطیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے جبران نے کہا:
>
> ''لبنا تمھیں کب شعور آئے گا۔ ہمارے بعد میں جن لوگوں کی شادیاں ہوئی ہیں وہ سب خوش وخرم ہو کر زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن تم نے میرا جینا ہی حرام کر دیا ہے۔ ایک تو آفس سے جل بھن کر آؤ اوپر سے گھر میں سکھ کے بجائے دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

عبرت چائے لے کر آتی ہے ۔لو بیٹا تم چائے۔۔۔۔۔'' ۔اور تمھارے گھر میں شادی کی تیاریاں کیسی چل رہی ہیں۔''

جبران: ''جی آنٹی اب تو کارڈ بٹنا بھی شروع ہو گئے ہیں ۔بس دو چار دن میں بہنوں کی آمد کا سلسلہ۔۔۔اچھا آنٹی اب اجازت دیں۔۔۔میں چلتا ہوں ۔اللہ حافظ

اقرا: 'اچھا باجی تم تو یہ بتاؤ کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو کتنے دنوں کے بعد ہم سے ملنے آیا کرو گی۔''

لبنا: ''میں تم سے ملنے کیلئے کبھی نہیں آؤں گی۔کیونکہ تم مجھ سے بالکل بھی خوش نہیں ہوتی۔''

اقرا: ''ارے باجی میں تو آپ سے مذاق کرتی ہوں ۔لیکن یہ تو بتاؤ جبران بھائی سے لڑائی کے بعد بھی میکہ نہیں آؤ گی ؟''

لبنا: غصہ میں'' ہاں ہاں ،نہیں آؤں گی کبھی ،میں نے کہا نا ایک بار سمجھ نہیں آتی بات ۔''

افسردگی کی عالم میں'' اماں تم ہی بتاؤ کہ میں جبران کی فیملی کو کیسے مطمئن رکھ سکوں گی۔''

عبرت: ''ارے پگلی اب تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ڈرنے والی کون سی بات ہے ۔آخر وہ بھی تو ہماری ہی طرح انسان ہی ہے ۔جبران کی ماں سے تم پہلے بھی مل چکی ہو کتنی خوش اخلاق عورت ہے ۔مجھے معلوم ہے وہ تمہیں بہت زیادہ پیار کریں گی وہ تمھیں اپنی بیٹیوں سے زیادہ عزیز رکھیں گی۔''

لبنا: ''ماں لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عبرت: ''چلو ہٹ بھی جاؤ اب ! نئے رشتے کے بارے میں زیادہ منفی نہیں سوچتے ہیں ۔

یہ رشتہ بھی نا۔۔۔بنانے سے پہلے اس کے بارے میں کتنا کچھ سوچا جاتا ہے ۔کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناطہ جڑنے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گا۔۔۔لیکن جب ایک بار رشتہ بن جاتا ہے دو دل آپس میں مل جاتے ہیں تو اس کو نبھانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔لوگوں کے لئے یہ مشکل ترین عمل ضرور رہے کہ وہ اپنے رشتوں کو بحسن وخوبی نبھا پائیں لیکن اکثریت کس خود اعتمادی کے ساتھ ہر چھوٹے اور بڑے رشتہ کو نبھانے کی کوشش کرتا ہے اس کی تعریف میں ہمارے پاس موجود الفاظ بھی بسا اوقات کم پڑ جاتے ہیں ۔

عبرت لبنا کو وداع کرتے ہوئے حمیرا بیگم سے: ''بہن میں نے اپنی بیٹی کو بڑی نازوں سے پالا ہے خدا کے لئے اس کا خاص خیال رکھنا ،اپنی بیٹی ہی سمجھنا۔''

حمیرا بیگم: ''عبرت تم تو اپنی بیٹی کے بارے میں بیکار ہی ڈر رہی ہو تمھیں معلوم ہے ۔لبنا مجھے کتنی پسند ہے ۔اس نے سسرال جانے سے پہلے ہی ہم لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا لی ہے ۔اس لئے تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

جس بیٹی کو ماں اپنے کومل کومل ہاتھوں سے برسوں پرورش کرتی ہے وہ دل بیقرار ہوئے بغیر اپنی بیٹی کو کیسے وداع کر دے ۔عبرت کو آج بہت خوشی تھی کہ اس کی پیاری بیٹی بیاہ کر سجن کے گھر جا رہی ہے ۔لیکن وہ ان لمحات کو یاد کر کے کچھ زیادہ ہی مغموم ہو گئی اور کہنے لگی کہ کاش آج ان کے ابا زندہ ہوتے تو ان سارے مناظر کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتے ۔دراصل لبنا کے والد کا اچانک ایک ناگہانی حادثہ میں انتقال ہو گیا تھا ۔بھائی بہنوں میں بس لبنا دو بہنیں ہی تھیں ۔عبرت شوہر کے انتقال کے بعد بہت زیادہ ٹوٹ گئی تھی ۔بے چاری مرتی کیا نہ کرتی لیکن اس نے خود کو اپنی دونوں بیٹیوں کو سنبھالا اور سماج و حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔آج اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اس کی سہیلی حمیرا بیگم کے گھر دلہن بن کر جا رہی تھی ۔وہ حمیرا بیگم کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھی لیکن بعض اوقات انھیں اپنی غلطی پر پچھتاوا بھی ہوتا کہ'' اس نے اپنی بیٹی کو پڑھانے لکھانے کے ساتھ ساتھ گھر گرہستی کے کوئی گن نہیں سکھا پائی ۔لیکن اب پچھتاوت کا ہوئت جب چڑیا چگ گئی کھیت ۔بس میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اس کی گھر گرہستی اچھے سے نبھ جائے ۔

شادی کے کئی دن گزر جانے کے بعد اب لبنا کی زندگی کا اصل امتحانی دور شروع ہوا۔جب تک نندیں ان کے گھر میں رہیں تب تک سب نے اس کو آنکھوں پر بٹھائے رکھا لیکن اب سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں ۔ چھوٹی نند عائشہ بھی ہوسٹل چلی گئی ۔گھر میں باقی ماندہ لوگوں میں جبران ،لبنا ساس اور ایک دیور و سسر ہی تھے ۔جس نے کبھی اپنے گھر کے کسی کام میں ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اب اس کے سر پانچ لوگوں کی ذمہ داریاں تھیں ۔

جبران: ''اماں دیکھیں نا لبنا کیسی پھوہڑ ہے اس سے تو کوئی کام آتا ہی نہیں ۔میں نے اپنی شرٹ میں بٹن ٹانکنے کے لئے دیا تھا کس طرح اس کو الٹا سیدھا ٹانک دیا ہے ۔''

حمیرا بیگم: ''بیٹا ابھی نئی نئی ہے ۔دیکھو سب سیکھ جائے گی ،چلو لاؤ میں ٹانک دیتی ہوں ۔

جبران قدرے ناراضگی کے ساتھ آفس کے لئے روانہ ہو گیا۔

رفتہ رفتہ زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے ۔لبنا اپنے تمام رشتوں کو نبھانے میں پوری طرح مصروف تھی ۔لیکن رشتوں کو صرف پیار و محبت کی بنیاد پر قائم رکھنا ہی جانتی تھی ۔قریب قریب ایک سال کا وقفہ گزرنے والا تھا ۔لبنا اپنے گھریلو کاموں کے تئیں ملنے جلنے والوں ،ان کو بٹھانے ،چائے ناشتہ پوچھنے ،شوہر کے کاموں کا خیال رکھنے ،گھر میں رہنے والے لوگوں کے خاطر داری کے شعور سے اب بھی پوری طرح نا آشنا تھی ۔جس کی وجہ سے لبنا کو بارہا اپنے شوہر سے ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ۔ایک روز آفس سے آنے کے بعد معمول کے مطابق غلطیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے جبران نے کہا:

''لبنا تمھیں کب شعور آئے گا۔ہمارے بعد میں جن لوگوں کی شادیاں ہوئی ہیں وہ سب خوش وخرم ہو کر زندگی گزار رہے ہیں ۔لیکن تم نے میرا جینا ہی حرام کر دیا ہے ۔ایک تو آفس سے جل بھن کر آؤ اوپر سے گھر میں سکھ کے بجائے دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

لبنا سر نیچے کر کے شوہر کی بات خاموشی سے سننے کے بعد کہنے لگی: میں سیکھنے کی کوشش تو کر رہی ہوں نا سیکھ جاؤں گی آہستہ آہستہ ۔

جبران: ''لبنا تم کب سیکھو گی !ایک سال سے زائد کا عرصہ تمھیں یہی کہتے کہتے گزر گیا۔

لبنا غصہ کی حالت میں: ''تو میں کیا کروں واپس ماں کے گھر چلی جاؤں کام سیکھنے کیلئے ۔''

جبران: ''ہاں تمھیں اگر لگتا ہے کہ تم اپنے ماں کے گھر جا کر کام سیکھ سکو تو ایسا کر لو ۔کم از کم تم سے جان تو چھوٹے گی۔

لبنا جبران کی جلی کٹی باتوں سے تنگ آ چکی تھی ۔اس نے آج فیصلہ کر لیا کہ وہ ماں کے گھر جائے گی اور جب تک جبران اسے لینے کیلئے نہیں آئے گا تب تک وہ واپس نہیں آئے گی ۔ اس لئے اس نے کچھ ضروری کپڑے لئے اور ماں کے گھر کے لئے نکل پڑی ۔شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اب ماں کا گھر اس کے لئے پرایا گھر ہے ۔اس کی ماں نے تو اسے حمیرا بیگم کے سپرد کر دیا تھا۔اب اس کے دکھ درد ،رنج و غم کا مداوا کرنے والے وہی لوگ ۔۔۔۔۔۔۔۔لبنا ماں کے گھر پہنچ کر اس امید پر دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹاتی ہے کہ اس کی ماں اس کو اس حال میں دیکھ کر سینے سے لگائے گی۔

گھر کا بیل مسلسل بج رہا ہے ۔۔۔ٹرنگ۔۔۔ٹرنگ ۔ٹرنگ

''آواز آئی کون ؟''

''اماں میں لبنا ہوں ۔آپ کی بیٹی۔۔۔''

''کون بیٹی ! میری تو دو بیٹیاں تھیں ایک تو اب پرائی ہو گئی ہے اور دوسری میرے پاس موجود ہے ۔اور میری بیٹی لبنا تو اپنے شوہر کے گھر سے اکیلی نہیں آ سکتی ۔''

ماں کی زبان سے یہ جملہ سن کر لبنا کے پیروں تلے زمین کھسک گئی ۔اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس حال میں وہ کیا کرے ۔وہ ماں کی اس محبت اور بے رخی کو پوری طرح سمجھ چکی تھی ۔اس لئے اب اس نے سوچ لیا کہ اب اپنی بقیہ کی تمام عمر ہر حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ سسرال میں ہی گزارے گی اور وہ سسرال واپس آ گئی ۔جبران نے شام کو جب لبنا کو گھر پر دیکھا تو اسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔

❑❑❑

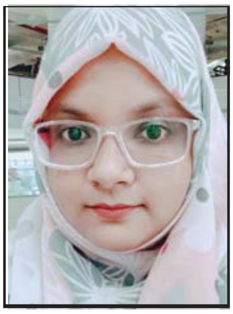

حمیرا عالیہ

ریسرچ اسکالر،لکھنؤ یونیورسٹی،لکھنؤ

7060695172

افسانہ

جرم خانہ خراب

شہر بانو جس دن گریجویشن کا آخری امتحان دے کر گھر میں داخل ہوئیں اسی دن اماں صاحب نے انہیں رشتہ طے پا جانے کی خبر سنادی۔ شہر بانو پہلے تو گھبرائیں لیکن پھر شارب حسین کی تصویر دیکھتے ہی ان پر شرم غالب آگئی اور انہوں نے دل و جان سے اس رشتے کو قبول کرلیا اور کیوں نہ کرتیں۔ آکسفرڈ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے واپس آنے کے بعد شارب حسین کی وجاہت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اونچے لمبے سرخ وسفید شارب حسین کی بھوری آنکھوں میں شہر بانو پور پور ڈوب گئیں۔

شہر بانو کو جلد ہی مایوں بٹھادیا گیا۔ اب روز سرِ شام ہی بند کمرے میں ناون ان کے شہابی بدن پر صندل کے ابٹن کا مساج کرتی اور روز اماں صاحب سے شکوہ کرتی کہ شہر بانو کے گلابی مرمریں جسم کو کسی ابٹن کی ضرورت نہیں۔ لیکن اماں صاحب خاندانی عورت تھیں اور انہیں روایت سے عشق تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ شہر بانو کو ابٹن خوبصورتی کی طلب میں نہیں بلکہ روایت کی پاسداری میں لگایا جاتا ہے۔ ہاں ابٹن لگانے سے یہ فائدہ ضرور رہوا کہ شہر بانو کے جسم میں صندل اور گلاب کی بھینی بھینی خوشبو رچ بس گئی۔ جس دن انہیں مہندی لگائی گئی اس دن تو یہ خوشبو سہ آتشہ بن کر دہک اٹھی۔

آخر وہ دن آہی گیا جب شہر بانو شارب حسین کی دلہن بن کر ان کے گھر آ گئیں۔ وہ مہکتے جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ شارب حسین کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ دلہن کے استقبال کی تمام رسومات پوری ہو چکی تھیں۔ تھکن سے شہر بانو کا جسم چور تھا لیکن شارب حسین کی آمد کے تصور سے ان کو ایک پر کیف لذت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی انتظار میں کب ان کا تھکا ماندہ جسم نیند کی آغوش میں اتر گیا انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ موذن نے الصلاۃ خیر من النوم کی صدا دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔ شارب حسین اب تک نہیں آئے تھے۔ انہوں نے زربفت کا سچے کام والا غرارہ سمیٹا اور خاموشی سے واش روم میں چلی گئیں۔ کپڑے تبدیل کر کے انہوں نے وضو کیا اور جانماز پر کھڑی ہوگئیں۔

نماز مکمل کر کے وہ تسبیح کی آخری دانے پر تھیں جب شارب حسین کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک اچٹتی ہوئی سی نظر شہر بانو پر ڈالی اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ شہر بانو نے جانماز تہہ کی اور اسی خاموشی کے ساتھ بستر پر بیٹھ گئیں۔

”مجھے زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔ آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ اس شادی میں میری مرضی شامل نہیں ہے۔ آپ ماما کی پسند ہیں اور انہیں آپ ہمارے خاندان کے لئے بہتر لگیں۔ میں ایک روشن خیال آدمی ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ آپ میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔“

شہر بانو نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کس قدر وجیہہ اور باوقار تھے وہ لیکن کتنے سنگ دل۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ آپ کو میری طرف سے پوری آزادی ہے۔ جس طرح چاہیں رہیں بس مجھ سے ان باتوں کا مطالبہ نہ کیجئے جو ٹپیکل قسم کی بیویاں کرتی ہیں۔ مجھے اپنے معاملات میں دخل اندازی بالکل نہیں پسند ہے۔“

شہر بانو نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ یکے بعد دیگرے ملنے والے دھچکوں نے جیسے ان کی قوت گویائی صلب کرلی تھی۔ وہ یونانی دیوی کے حسین مجسمے کی مانند ساکت ہوگئی تھیں۔ شارب حسین شیروانی اتار کر غسل خانے میں جا چکے تھے۔ باہر سے کوئی کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک دے رہا تھا۔ ان کا سکتہ ٹوٹا۔ گہری سانس لے کر انہوں نے آنکھ میں آنے والے آنسوؤں کو خشک کیا اور دروازہ کھولنے لگیں۔

”ماشاءاللہ دلہن۔“ اماں حضور نے دوپٹے میں لپٹا ان کا چہرہ چوم لیا۔

”مجھے یقین ہے کہ میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔ تمہاری پیشانی کہتی ہے کہ تم خاندانی لڑکی ہو اور ہمیشہ خاندان کی عزت و ناموس کا خیال رکھوگی۔“

شہر بانو نے شکوہ کناں نگاہوں سے اماں حضور کی جانب دیکھا۔ کتنی آسانی سے انہوں نے شہر بانو پر اتنی بڑی ذمہ داری ڈال تھی۔

”سگنل کھلا تو ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ لیکن ڈرائیور کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر آئینے کی طرف ہی اٹھ رہی تھیں۔ شہر بانو نے غیر محسوس طریقے سے خود پر نظریں دوڑائیں۔ آج ایسا کیا ہوگیا تھا جو ڈرائیور پہلی دفعہ ایسی حرکت کر رہا تھا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ شارب حسین کا فون سننے میں وہ اپنے سیاہ دستانے پہننا بھول گئی تھیں۔ نقاب کی کالی آستینوں سے ان کی نرم و نازک گلابی ہتھیلیاں جگمگا رہی تھیں۔ مخروطی انگلیوں پر لگی مہندی ان کے حسن کے دوبالا کر رہی تھی۔

شہر بانو نے دوبارہ آئینے پر نگاہ ڈالی۔ ڈرائیور ان کے ہاتھوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ شہر بانو کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ پہلی دفعہ کوئی مرد ان کی جانب اتنے غور سے دیکھ رہا۔ انہوں نے ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے چور نگاہوں سے پھر آئینے کی طرف دیکھا۔ اس بار ان کی نگاہ ڈرائیور کی نگاہ سے لڑ گئی۔ شہر بانو کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ کیسا احساس تھا۔ ان کی پیٹھ پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔“

کیا عزت و ناموس کی پاسداری صرف عورت پر لازم ہے؟

شارب حسین اپنے الفاظ کے پکے تھے۔ انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ شہر بانو ان کی پسند نہیں ہیں۔ شادی کے ہنگامے ختم ہونے کے بعد جب اماں حضور گاؤں کی حویلی واپس چلی گئیں تو شارب حسین نے اگلے روز سے ہی اپنا کمرہ علیحدہ کر لیا۔ شہر بانو راتوں کو آئینے کے سامنے تنہا کھڑی اپنے دودھیا حسن کو وحشت سے تکا کرتیں۔ کالج کے دنوں میں لڑکیاں کیسے کیسے انہیں چھیڑتی تھیں۔

"بانو تیری گردن پر تو روز صبح لو بائٹ نظر آئیں گے۔" کوئی ان کی صندلی گردن پر فقرہ کستی۔

"یار تمہارا دولہا تو رات بھر ان ریشمی زلفوں سے ہی آزاد نہ ہو پائے گا۔ ناگن ساتھ لے کر چلتی ہو تم۔" کوئی ان کی کمر تک آتی چوٹی کو نہارتی۔

"اور اس کی ہتھیلیاں دیکھو۔ کیا ان پر کوئی گرفت سخت کر سکتا ہے؟"

شہر بانو آئینے سے جواب طلب کرتیں۔

Who is the fairest of one em all?

آئینہ جواب دیتا:

You my Queen are the fairest of all

شہر بانو دیکھے جاتیں۔ آئینہ سراہے جاتا لیکن وہ کچھ نہ کہتا جو اس حسین بدن اور ان دلآویز خطوط پر مکمل اختیار رکھتا تھا۔

ہفتے کا دن تھا۔ شہر بانو کو میکے جانا تھا۔ حسب معمول ڈرائیور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہاتھوں پر سیاہ دستانے پہن کر نکلنے ہی والی تھیں کہ شارب حسین کا فون آ گیا۔

"آج رات میں اپنی امی کے گھر رک جائیے گا۔ میں دوستوں کی طرف رہوں گا۔"

شہر بانو چونک گئیں۔ اس سے قبل شارب حسین نے کبھی گھر سے باہر رات نہیں گزاری تھی۔ لاکھ اجنبیت کے باوجود وہ رات گھر پر ہی گزارتے۔ جب تک ان کے کمرے کی لائٹ بجھ نہ جاتی شہر بانو جاگتی رہتی تھیں۔

"پھر آج کیا خاص بات ہے؟"

وہ سوچوں میں غلطاں پیچاں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ سگنل پر گاڑی رکی تو شہر بانو اپنی سوچوں سے باہر آئیں۔ تبھی ایک انجانے احساس کے تحت انہوں نے گاڑی کے آئینے کی طرف دیکھا تو ڈرائیور کی نگاہ اپنی جانب مرکوز پایا۔ انہیں آئینے کی طرف دیکھتا پا کر ڈرائیور نے گھبرا کر نگاہیں تبدیل کر لیں۔ شہر بانو کی آنکھوں میں ناگواری اتر آئی۔

سگنل کھلا تو ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ لیکن ڈرائیور کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر آئینے کی طرف ہی اٹھ رہی تھیں۔ شہر بانو نے غیر محسوس طریقے سے خود پر نظریں دوڑائیں۔ آج ایسا کیا ہو گیا تھا جو ڈرائیور پہلی دفعہ ایسی حرکت کر رہا تھا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ شارب حسین کا فون سننے میں وہ اپنے سیاہ دستانے پہننا بھول گئی تھیں۔ نقاب کی کالی آستینوں سے ان کی نرم و نازک گلابی ہتھیلیاں جگمگا رہی تھیں۔ مخروطی انگلیوں پر لگی مہندی ان کے حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔

شہر بانو نے دوبارہ آئینے پر نگاہ ڈالی۔ ڈرائیور ان کے ہاتھوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ شہر بانو کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ پہلی دفعہ کوئی مرد ان کی جانب اتنے غور سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے چور نگاہوں سے پھر آئینے کی طرف دیکھا۔ اس بار ان کی نگاہ ڈرائیور کی نگاہ سے لڑ گئی۔ شہر بانو کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ کیسا احساس تھا۔ ان کی پیٹھ پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ ان کے اندر دوبارہ نگاہیں اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ انہوں نے بظاہر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا لیکن انہیں محسوس ہو رہا تھا گویا ڈرائیور کی نگاہوں کی حدت ان کی ہتھیلیوں کو پگھلائے دے رہی ہے۔

نہ جانے کب یہ راستہ ختم ہوا اور کب ان کی منزل آ پہنچی انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ گاڑی جب ایک جھٹکے سے ان کے بڑے سے کتھئی گیٹ کے سامنے رکی تب وہ ہڑبڑا کر اتریں۔

"رات میں لینے مت آنا۔ کل صبح واپسی ہوگی۔"

وہ ڈرائیور کی طرف دیکھے بغیر بولیں اور تیز قدموں سے اندر داخل ہو گئیں۔

اس بار میکے آ کر وہ افسردہ ہو گئیں۔ بابا صاحب کافی بیمار تھے۔ وہ ماں صاحب کو تسلیاں دیتی رہیں اور اپنی ازدواجی زندگی کی من گھڑت کہانیاں سنا کر انہیں مطمئن کرتی رہیں۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹیں تو ایک دم ڈرائیور کی آنکھیں چھم سے ان کے خیالوں میں اتر آئیں۔ کیسی گہری نگاہیں تھیں جو بار بار ان کی ہتھیلیوں کی جانب پلٹ آ رہی تھیں۔ گویا ان نگاہوں پر خود کا اختیار نہ ہو۔ تو کیا یہ ان کے ہاتھوں کا حسن تھا جو ڈرائیور کو بے قابو کر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ اتنی خوبصورت تھیں۔

ڈرائیور کا خیال آتے ہی وہی عجیب احساس دوبارہ ان پر حاوی ہونے لگا۔ اس بار چیونٹیاں پیٹھ سے ہوتی ہوئی گردن اور پھر سینے پر اترنے لگیں۔ شہر بانو نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ لیکن چیونٹیوں کا سفر جاری رہا۔ وہ سینے سے نیچے آ کر پیٹ پر پھیل گئیں تھیں۔ ان کے رینگنے سے شہر بانو کو ایک عجیب لذت آمیز گدگدی ہو رہی تھی۔ انہوں نے سرور میں آنکھیں بند کیں تو ڈرائیور کی آنکھیں ان کی ہتھیلیوں کو گرمانے لگیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ شدت سے صبح کا انتظار کرنے لگیں۔

اگلی صبح وہ آٹھ بجے سے ہی دروازے کے چکر کاٹنے لگیں۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ ڈرائیور دس بجے سے پہلے نہیں آئے گا پھر بھی انہیں انتظار کرنے میں عجیب سا لطف آ رہا تھا۔ آخر کار دس بجنے میں سات منٹ باقی تھے کہ انہیں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

شہر بانو کا دل تیزی سے دھڑکا۔ انہوں نے عبایا پہنا اور ماں صاحب سے گلے مل کر باہر نکل گئیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے غیر محسوس طریقے سے عبایا کی ایک آستین تھوڑی سی اوپر کھسکا لی۔ یوں کہ ان کی سنہرے روئیں والی گوری کلائی عیاں ہو گئی۔

گاڑی کچھ دور چلی تو انہوں نے نامحسوس طریقے سے آئینے کی جانب دیکھا۔ ڈرائیور کی نگاہیں سڑک پر متوجہ تھیں۔ شہر بانو کو مایوسی ہوئی۔ کیا ڈرائیور نے ان کی جانب نہیں دیکھا۔ انہوں نے پرس سے موبائل نکالنے کے بہانے ہاتھ ہلایا تو چوڑیاں کھنک اٹھیں۔ ڈرائیور نے فوراً نظریں اٹھائیں تو شہر بانو ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس بار ڈرائیور نے نظریں نہیں ہٹائیں بلکہ چند لمحے شہر بانو کو وارفتگی سے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ انہوں نے خود نظریں جھکا لیں۔ ڈرائیور نے رفتار کم کی۔ نگاہ بھر کر ان گوری کلائیوں کو دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔ چیونٹیاں شہر بانو کے جسمانی خطوط پر سفر کرتی رہیں۔

اس دن شہر بانو نے گھر پہنچ کر دستانوں کو الماری کے اوپری خانے میں ڈال دیا۔ شام میں شارب حسین آئے تو شہر بانو چائے لے کر ان کے کمرے میں گئیں۔ رسمی سلام کلام کے بعد شارب حسین کو چائے دے کر وہ کمرے سے نکلنے لگیں کہ اچانک 'اللہ' کہہ کر فرش پر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا؟" شارب حسین کپ رکھ کر تیزی سے آگے بڑھے۔

"پاؤں مڑ گیا شاید۔" وہ یوں جھک کر بیٹھی تھیں کہ گلے سے نیچے کے ابھار نمایاں ہو گئے۔

شارب حسین نے جھک کر انہیں سہارا دیا اور بستر پر بٹھا دیا۔ ان کی سپید گردن اور قیامت خیز خطوط پر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ شہر بانو غصے سے تلملا اٹھیں۔

"آپ یہاں آرام کریں میں گیسٹ روم میں سو جاتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے شکوہ کناں نگاہوں سے انہیں دیکھا اور آہستہ روی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئیں۔ اپنے نظر انداز کئے جانے کا غم انہیں ان دیکھی آگ میں جلا رہا تھا۔ تمام رات وہ کروٹیں بدلتی رہیں حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ انہوں نے حسب معمول شارب حسین کو ناشتہ دیا اور ان کے آفس جانے کے بعد خود غسل کر کے تیار ہونے لگیں۔ آئینہ دیکھتے ہوئے انہیں ڈرائیور کا خیال آیا اور وہ ہنس پڑیں۔ تیار ہو کر انہوں نے عبا پہنی اور خوشبو لگا کر باہر نکل گئیں۔ آج وہ ڈریسنگ ٹیبل پر سیاہ جرابیں چھوڑ گئی تھیں۔

"فینکس مال تک چلو۔" انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے حکم دیا اور غیر محسوس طریقے سے آستیں اوپر کھینچ لی۔

ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے گاڑی بڑھا دی۔ آج شہر بانو کے گلابی نرم و نازک بے داغ پیر سیاہ سینڈل میں اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ ڈرائیور کی نگاہ شیشے سے ہوتی ہوئی کبھی ہاتھوں کبھی پیروں تک جا رہی تھی۔ اور پیچھے شہر بانو اپنے ساتھ چیونٹیوں کے سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

سگنل پر گاڑی رکی تو ڈرائیور نے آئینے پر نگاہ مرکوز کر دی۔ وہ بغیر کسی ڈر کے آزادی کے ساتھ شہر بانو کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جہاں خواہشوں کا بھانبھڑ جل رہا تھا۔ ڈرائیور کی نظروں نے بے باکی سے شہر بانو کے چہرے کی جانب سے نیچے اترنا شروع کیا۔ گو وہ مکمل عبا میں تھیں لیکن ڈرائیور کی نگاہوں کی گرمی انہیں اپنے بدن پر آگ کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں شہر بانو کے سینے پر آ کر ٹھہر گئیں۔ شہر بانو کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ قبل اس کے کہ وہ نگاہیں مزید گہرائیوں کا سفر کرتیں سگنل کھل گیا۔

ڈرائیور کی نگاہیں جوں جوں گہری ہوتی گئیں شہر بانو اپنی چیزیں ڈریسنگ ٹیبل پر بھولتی گئیں۔ چوکیدار نے اپنے فرض سے کوتاہی کی تو چور دروازہ پوری طرح سے کھل گیا۔ آخری چیز جو وہ ڈریسنگ ٹیبل پر بھولیں وہ کالی چادر تھی جسے انہوں نے عبا ترک کرنے کے بعد اوڑھنا شروع کیا تھا۔ شروع میں ماں صاحب نے اعتراض کیا تو شہر بانو نے شارب حسین کا بہانہ بنا کر انہیں خاموش کرا دیا تھا۔ ویسے یہ سچ بھی تھا۔ شارب حسین کو نہ ان سے کوئی دلچسپی تھی نہ ان کے پردے سے۔

ہاں جسے شہر بانو میں دلچسپی تھی اس کا شہر بانو خوب خیال کرنے لگی تھیں۔ بات اب نگاہوں کے سفر سے جملوں کے تبادلے اور پھر ہلکے پھلکے لمس تک پہنچ چکی تھی۔ کوئی چیز پکڑاتے ہوئے ہاتھ دبا دینا، گاڑی سے اترتے ہوئے یونہی سہارا دے کر اتارنا یا تیز بریک کے بہانے شہر بانو کا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دینا معمول کی باتیں تھیں۔ ڈرائیور کی بے باک نگاہیں اور تعریفی جملے انہیں انجانی سی تسکین دیتے۔

اس لک چھپ زندگی میں طوفان اس وقت آیا جب بابا صاحب داغ مفارقت دے گئے اور ان کے دو مہینوں بعد ماں صاحب بھی شہر بانو کو تنہا چھوڑ کر چل بسیں۔ شہر بانو کو اس حادثے سے سنبھلنے میں کافی وقت لگ گیا۔ اور جب وہ اس حادثے سے سنبھلیں تو دوسرا انکشاف ان کا منتظر تھا۔

اس دن وہ بارہ دری میں لگے سلک ایکسپو میں سہیلی کے ساتھ گئی تھیں۔ سفید پتھروں والی خوبصورت عمارت میں مختلف شہروں کے ریشمی ملبوسات اپنی بہاریں دکھلا رہے تھے۔ ہر سو رنگ اور قہقہے تھے۔ جب اچانک ان کی نگاہ داہنی جانب کے دروازے کے پاس لگے سجے پوری سلک کے اسٹال پر کھڑے شارب حسین پر پڑی۔ لیکن وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک خوش شکل اور بے حد ماڈرن لڑکی بھی تھی۔ شہر بانو سکتے کی کیفیت میں اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس نے اسکن ٹائٹ جینز کے ساتھ بے حد مختصر سلیولیس ٹاپ پہن رکھا تھا۔ اس کے عریاں شانے پر بکھری زلفیں اس کے جسمانی خطوط چھپانے میں ناکام تھیں۔

"تو یہ تھے تم شارب حسین۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ خاندانی سادات اور اعلیٰ قدروں کے حامل شارب حسین اس لڑکی کا ہاتھ تھامے ہنس رہے تھے اور شہر بانو ستون کی اوٹ میں کھڑی پنر جنم لے رہی تھیں۔

"سنو ارے یہ۔ کل میں تمہارے ساتھ پارٹی میں چلوں گی۔"

واپسی پر شہر بانو نے اپنی سہیلی سے کہا تو اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"تم؟"

"ہاں۔ گھر پر پڑے پڑے بور ہو جاتی ہوں۔ اچھا ہے کچھ مصروفیت ہو جائے گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار لیکن وہاں سر پر دوپٹہ اوڑھ کر پارٹی میں نہیں جاتیں عورتیں۔" سہیلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں تمہیں شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔"

اگلے دن شہر بانو نے اپنے تمام دوپٹے والے سوٹ اٹھائے اور انہیں کام والی ماسی کو دے دیئے۔ رات کی پارٹی کے لئے انہوں نے اسپیشل خریداری کی اور گھر آ کر تیار ہونے لگیں۔ اس رات شہر بانو نے اپنے پیروں سے لپٹی تمام بیڑیاں توڑ ڈالیں۔

گہرے گلے والے بیک لیس بلاؤز اور نیٹ کی سیاہ ساڑی میں ان کے جسم کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ سڈول گوری باہیں اور قیامت خیز کمر کی دلآویز لچک آئینے میں دیکھ کر وہ طنزیہ ہنسی ہنس پڑیں۔

وہ کمرے سے باہر آئیں تو تمام ملازمین انہیں دیکھتے رہ گئے۔ جس شہر بانو کے سر کے بال تک کسی نے نہ دیکھے تھے آج وہ نیم عریاں حسن کا مجسمہ بن کر ان کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھیں تو ڈرائیور بھی پلکیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھتا رہ گیا۔

"آج آپ قیامت ڈھا رہی ہیں۔ خدا کی قسم آج کئی لوگ جان سے جائیں گے۔"

ڈرائیور نے ان کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے آہستگی سے سرگوشی کی۔ وہ ادا سے ہنس پڑیں۔

"پارٹی میں جانے سے قبل مجھے پھولوں کی دکان پر لے چلو۔ گلدستہ لینا ہے۔"

"جی بہتر۔"

پھولوں کی دکان سے ذرا فاصلے پر سڑک کے کنارے گاڑی روک کر ڈرائیور پھول لینے چلا گیا۔ جب وہ گلدستہ لے کر آیا تو شہر بانو گاڑی سے باہر اتر کر کھڑی تھیں۔

"بہت دیر لگا دی تم نے"

"جی ہاں مجھے آپ کے لئے اس کی تلاش تھی۔"

اس نے سرخ گلاب کا نوخیز پھول ان کے سامنے کیا۔ شہر بانو کی آنکھوں میں گلابیاں ابھرنے لگیں۔ وہ یونہی کھڑی رہیں۔

ڈرائیور آہستہ سے قریب آیا اور گلاب کا پھول ان کی سیاہ زلفوں میں لگانے لگا۔ اس کی سانسیں شہر بانو کی پیشانی سے ٹکرا رہی تھی اور شہر بانو کا جسم یکلخت چیونٹیوں سے بھر گیا۔ انہیں لگا سڑک کنارے ایستادہ اشوک کے تمام درخت جھوم جھوم کر کہہ رہے ہیں:

You are my Queen fairest of em all

ڈرائیور نے نرمی سے پھول ان کے بالوں میں لگا یا۔ اب اس کے ہاتھ ان کی زلفوں سے ہوتے ہوئے پشت پر جا رہے تھے اور جونہی اس کی سخت ہتھیلیاں شہر بانو کی مخملی پشت سے ٹکرائیں انہیں گویا کسی چنگاری نے چھو لیا۔ وہ تڑپ کر ڈرائیور سے لپٹ گئیں۔ ڈرائیور کی مضبوط باہوں نے بے قراری سے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ شہر بانو کا جسم اس کی باہوں میں موم کی مانند پگھلنے لگا۔

لیکن ڈرائیور نے اتنی ہی نرمی سے سمیٹ کر انہیں گاڑی میں بٹھا دیا۔

''ابھی نہیں۔'' اس نے تسلی دی۔

اس رات پارٹی میں شہر بانو کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بھرپور اور کتنی حسین تھیں۔ وہاں پر موجود تقریباً ہر مرد بہانے بہانے سے ان کے پاس آرہا تھا۔ لوگوں کی سراہتی نگاہوں اور ذو معنی باتوں سے انہیں لطف آرہا تھا۔ کتنا ترسایا تھا شارب حسین نے انہیں اس توجہ کے لئے۔ تو کیا ہوا اگر شارب حسین نہیں۔ حسن کو سراہنے والوں کی کمی تھوڑی ہے اس دنیا میں۔ آج پہلی بار ان کے جسم پر چیونٹیاں نہیں رینگ رہی تھیں۔ لوگوں کا جسم ان کے جسم کے ساتھ ٹکرا رہا تھا اور وہ اس ٹکراؤ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ وہ ان کی زندگی کی حسین ترین رات تھی۔

اگلی صبح ایک عجوبہ ہوا۔ شارب حسین ان کے کمرے میں تشریف لائے۔

''آپ یہاں؟ آئیے بیٹھے۔''

شہر بانو کا دل پہلے کے انداز میں دھڑکا۔

''شہر بانو۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ میں اس شادی کے لئے شروع سے راضی نہیں تھا لیکن اماں حضور کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا۔ دراصل مجھے ایک ماڈرن بولڈ اور اپ ٹو ڈیٹ ساتھی کی خواہش تھی۔ آپ جیسی شرمیلی اور مشرقی لڑکی کبھی بھی میرا معیار نہیں تھی۔''

شارب حسین نے ہمیشہ کی طرح ان کی خوش فہمی ختم کر دی۔

''تین مہینے قبل میں ناعمہ سے ملا۔ اس سے مل کر مجھے لگا میری تلاش ختم ہو گئی۔ ناعمہ وہی لڑکی ہے جس کی میں ہمیشہ سے آرزو کرتا تھا۔ وہ بولڈ ہے اور مردوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا ہنر جانتی ہے۔''

شہر بانو سپاٹ چہرہ لئے سنتی رہیں۔

''میں ناعمہ سے شادی کرنے جا رہا ہوں، لیکن اس کی شرط ہے کہ میں پہلے آپ کو طلاق دوں۔ میں خود بھی آپ کو اس زبردستی کے رشتے میں باندھے رکھنا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی شادی کے بعد میں اور ناعمہ بنگلور شفٹ ہو جائیں گے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' شہر بانو کے مضبوط اور مطمئن لہجے پر شارب حسین کو حیرت ہوئی۔

''میں یہ گھر آپ کے نام کر رہا ہوں۔ مہر کی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی ہے۔ آپ میکے جانا چاہتی ہیں تو جا سکتی ہیں۔ یہ گھر ہمیشہ آپ کا رہے گا۔''

یوں شہر بانو کی زندگی کا ایک حصہ مکمل ختم ہو گیا۔

شارب حسین کو ناعمہ سے شادی کئے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ ان پانچ مہینوں میں تین بار ان کا گزر اپنے پرانے گھر کی طرف سے ہوا تھا۔ اس گھر میں نئے مکین رہنے لگے تھے۔ معلوم ہوا کہ شہر بانو نے وہ گھر بیچ دیا تھا اور شہر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ان کے میکے سے کئی رشتہ داروں نے وقتاً فوقتاً شارب حسین سے شہر بانو کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خود لاعلم تھے۔

ناعمہ سے شادی کر کے وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھنے لگے تھے۔ ناعمہ جیسی فیشن ایبل اور سوسائٹی میں موو کرنے والی لڑکی ہی ان کی پسند تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آجکل انہیں ناعمہ میں ویسی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ بنگلور کی آزادانہ فضا تھی جہاں ناعمہ جیسی ماڈرن لڑکیاں قدم قدم پر مل جاتی تھیں۔ لکھنؤ کے تہذیبی اور روایتی ماحول میں ناعمہ جیسی لڑکیاں ابھی عام نہیں تھیں شاید اسی وجہ سے ناعمہ انہیں اتنی منفرد لگی تھی۔ لیکن یہاں آ کر انہیں احساس ہوا کہ ناعمہ تو بہت عام سی لڑکی تھی۔ کھلے جسموں اور بے باک چہروں سے بہت جلد ان کا دل بھر گیا تھا۔ انہی ساعتوں میں ایک دن انہیں وہ مشرقی دلہن یاد آئی جس کا گھونگھٹ بھی انہوں نے نہیں پلٹا تھا۔

نئے سال کے موقعے پر انہیں اپنے باس کی طرف سے نائٹ پارٹی کی دعوت ملی۔ انہوں نے ناعمہ کو بطور خاص تیار ہونے کو کہا۔ ناعمہ جب تیار ہو کر آئی تو وہ ایک لمحے کو دیکھتے رہ گئے۔ وہائٹ فش کٹ گاؤن میں ناعمہ بالکل جل پری لگ رہی تھی۔ آج تو یقیناً ناعمہ پارٹی میں سب کی نگاہوں کا مرکز ہو گی۔

وہ پارٹی میں پہنچے تو تقریباً سبھی کولیگ آ چکے تھے۔

''شارب! بوس تیرا کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ وہ دیکھو ادھر کھڑے ہیں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ۔ جاؤ مل لو جا کر۔ آج تو رات میں نیند نہیں آئے گی قسم سے۔''

ان کے کولیگ راجیش نے سینے پر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

شارب حسین ناعمہ کو لے کر آگے بڑھے۔ بوس اور ان کی گرل فرینڈ کی پشت ان کی طرف تھی۔ شارب حسین نے دیکھا وہ جو کوئی بھی تھی نہایت سرو قامت اور دودھیا بدن کی مالک تھی۔ سرخ منی اسکرٹ اور ننھے سے سرخ بلاؤز میں اس کا جسم بجلی کی مانند نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ ایسا سانچے میں ڈھلا جسم انہوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ ریشمی زلفیں کمر پر لہرا رہی تھیں۔ وہ کسی بات پر ہنسی تو اس کی کھنکھناتی ہنسی شارب حسین کے دل میں گھنگھرو بجا گئی۔

''ہیپی نیو ایئر سر!''

انہوں نے قریب پہنچ کر باس کو مخاطب کیا۔

''او شارب۔ سیم ٹو یو۔ آؤ ان سے ملو۔ یہ ہیں میری لیڈی لک۔ سویٹ ہارٹ ان سے ملو یہ ہیں شارب۔ میرے چیف انجینئر۔''

شارب حسین نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ لیڈی لک نے ایک ادا سے زلفوں کو جھٹکا دیا اور ان کی طرف مڑی۔ شارب حسین کا ہاتھ ہوا میں جھولتا رہ گیا۔ ناعمہ کا چہرہ ان کی نگاہوں میں دھندلا گیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھونگھٹ میں سمٹی شہر بانو کو دیکھ رہے تھے جو سرخ منی اسکرٹ میں ان کے سامنے جلوے بکھیر رہی تھی۔

❑❑❑

لکھنؤ ایجنسی

ماہ نامہ نیا دور کے وہ قارئین جو اس کے مستقل ممبر نہیں ہیں اگر وہ نیا دور کی خریداری کے خواستگار ہیں وہ لکھنؤ میں ان مندرجہ ذیل ایجنسیوں سے رابطہ کریں۔

دانش محل:

امین آباد لکھنؤ۔ 9792361533

عرش پبلیکیشنز:

خواجہ ٹاور، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ۔ 9935915110

شاہد عباس

مفتی گنج، چوک لکھنؤ

9839346181

ترقیات

وزراء وی آئی پی کلچر سے گریز کریں

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے کابینہ میٹنگ میں وزراء کو 'بات چیت، تال میل اور حساسیت' کا منتر دیا اور انہیں ایک بار پھر عوام سے ملنے کی ہدایت دی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ حکومت عوام کے لیے ہے، ہمارے لیے عوامی مفاد سب سے مقدم ہے۔ ایسے میں معاشرے کے آخری پائیدان پر کھڑے شخص کے مسائل، توقعات اور ضروریات کا حل ہونا چاہیے۔ وزراء فیلڈ میں جائیں، حساسیت کے ساتھ عوام سے رابطہ کریں اور مقامی عوامی نمائندوں اور حکومتی انتظامیہ کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرکے مسائل حل کریں۔ جہاں بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو وزیر اعلیٰ آفس کو آگاہ کریں، آپ کو ہر وقت مکمل تعاون حاصل رہے گا۔ وزراء کے گروپ کے علاقائی دورے کے پروگرام دوبارہ شروع کیے جائیں۔

سب سے پہلے، وزیر اعلیٰ نے وزیر اعظم جناب نریندر مودی کی قیادت میں مسلسل تیسری بار مرکز میں حکومت کی تشکیل پر مبارکباد دی۔ انہوں نے ممبران پارلیمنٹ منتخب ہونے والے ریاستی حکومت کے وزراء کو بھی مبارکباد دی۔ انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم کے 10 سال کے دور میں جس طرح سے اتر پردیش میں ترقی نے رفتار حاصل کی ہے، ہم آنے والے 05 برسوں میں بہت سے نئے ریکارڈ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ تمام وزراء کو مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی کامیابیوں کی وسیع پیمانے پر تشہیر کرنا چاہیے۔ سوشل میڈیا پر سرگرمیاں بڑھائیں، عوام کو ڈبل انجن حکومت کی پالیسیوں، فیصلوں اور ان کے مثبت نتائج سے آگاہ کریں۔

وزراء سے گفتگو کے دوران وزیر اعلیٰ نے زور دے کر کہا کہ چاہے وزراء ہوں یا دیگر عوامی نمائندے، سب کو وی آئی پی کلچر سے پرہیز کرنا ہوگا۔ ہماری کوئی بھی سرگرمی ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے وی آئی پی کلچر کی عکاسی ہو۔ اس کے لیے سب کو ہوشیار رہنا ہوگا۔

محکمہ جاتی ایکشن پلان پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے، وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ریاستی حکومت 01 ٹریلین ڈالر کی معیشت کے ہدف کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس میں ہر محکمے کی ذمہ داری پہلے سے طے ہے۔ وزراء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اہداف کے مطابق پیش رفت کا جائزہ لیں۔ جہاں کوئی کمی ہو اسے فوراً دور کریں۔ مستقبل کے پروگراموں پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آنے والے دنوں میں بڑے پیمانے پر شجر کاری، اسکول چلو مہم اور وبائی امراض پر قابو پانے کے پروگرام ہوں گے۔ سب کو اپنی کامیابی کے لیے کوششیں کرنا ہوں گی۔ تمام وزراء اپنے اپنے علاقوں میں اپنے تعاون کو یقینی بنائیں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ مالی سال 2024-25 کی پہلی سہ ماہی ختم ہونے والی ہے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ تمام محکمے موجودہ بجٹ میں فراہم کردہ فنڈز کو مناسب طریقے سے خرچ کریں۔ محکمہ کی سطح پر اخراجات کا بھی جائزہ لیا جائے۔

وزیر اعظم کی رہنمائی میں ہمیں ریاست کی مجموعی ترقی کے لیے مرکزی حکومت سے ہر ممکن مدد مل رہی ہے۔ مرکز کے ساتھ تال میل قائم کرکے باقی رقم حاصل کریں۔ محکمہ کے وزراء کو خود حکومت ہند کے وزراء سے بات چیت کرنی چاہیے۔ فوکل پوائنٹ نہ ہونے کی وجہ سے پروجیکٹ میں خلل نہیں آنا چاہیے۔ قواعد کے مطابق ریاست کا حصہ جاری کرکے کام کو آگے بڑھائیں۔ تمام محکمے صد فیصد یوٹیلائزیشن سرٹیفکیٹ بروقت بھیجنے کو یقینی بنائیں۔

عوامی سماعت کو ترجیح دیتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ریاستی حکومت کی تمام عوامی فلاحی کوششوں کا مرکز عام آدمی کا اطمینان اور ریاست کی ترقی ہے۔ عام لوگوں کی شکایات/مشکلات کے آسان حل کے لیے (آئی جی آر ایس اور سی ایم ہیلپ لائن) ایک بہت ہی مفید ذریعہ ہے۔ خواہ وہ وزراء ہوں، دیگر عوامی نمائندے ہوں یا افسران/ملازمین، یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئی جی آر ایس پر موصول ہونے والی درخواستوں کو جلد اور ترجیحی بنیادوں پر تصفیہ کریں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ہم نے جرائم اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف زیرو ٹالرنس کی پالیسی اپنائی ہے۔ وزراء کو آئی جی آر ایس اور سی ایم ہیلپ لائن پر موصول ہونے والی درخواستوں کے بارے میں پولیس اسٹیشن، تحصیل اور ضلع کی سطح پر ہونے والی کارروائی کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ انہوں نے وزراء کی کونسل کے اجلاسوں کے لیے ای کیبنٹ سسٹم اور تمام محکموں میں ای-آفس کے موثر نفاذ پر بھی زور دیا۔

❑❑❑

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ یوم عالمی ماحولیات پر شجر کاری کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نیدر لینڈ کی سفیر سے ملاقات کرتے ہوئے۔

वर्ष : 77 अंक 9
जनवरी, 2023
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. गार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **रेहान अब्बास**